مُذاکرات سے مَارشل لاء تک

31

سردار عبدالقیوم خان

Marfat.com

صاحبِ کتاب

Marfat.com

مذاکرات سے
مارشل لاء تک

سردار محمد عبدالقیوم خان

جنگ پبلشرز

Marfat.com

81668

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	نومبر ۱۹۸۷ء
تعداد	ایک ہزار
سرورق	سلیم اختر
قیمت	۶۰/ روپے
طابع	میر شکیل الرحمان
مطبع	جنگ پبلشرز پریس
	۱۳۔ سر آغا خان روڈ، لاہور

Marfat.com

ترتیب

پیش لفظ	۱۳
تمہیدی کلمات	۱۵
مذاکرات سے مارشل لاء تک	۳۲
''گدڑ کھیڈ''	۳۳
اظہار حقیقت کا عزم	"
الزامات اور صاحب زادہ کی اہلیت	"
سیاست دانوں کی کردار کشی	۳۴
کچھ اپنے بارے میں	"
انداز تنقید اور اس کا رد	۳۶
شرط وفاداری	۳۷
سالہ جیل سے رہائی اور شکوک	۳۸
ایک ذہنی اُلجھن کا حل	"
ایم۔ آر۔ ڈی سے علیحدگی، شکوک و شبہات	۴۰
ذاتی اور قومی کردار میں تفریق	۴۱
اصول کی بات	۴۲
بھٹو دور حکومت کے ساتھ اختلافات اور ان کا نتیجہ	۴۳
بھٹو صاحب کی خواہش	"
اقتدار سے جبری علیحدگی کے بعد مصلحت کی پیش کش	۴۶
ناقابل تصوّر معاوضہ	۴۷
ناقابلِ یقین اعتماد کا اظہار	۴۹

Marfat.com

صدارت کی پیش کش	۵۰
منصفانہ انتخابات .... نتائج کا خوف	"
مذاکرات پر آمادگی اور معاوضے کی پیش کش	"
عفو و تعزیر	۵۲
حکومت ایک بار امانت	۵۳
حکومت و دولت کے مظاہر	"
استغناء کی نعمت	۵۴
اقتدار کے تقاضے اور شرمناک انتخابی دھاندلی	"
اقتدار سے بے نیازی اور حصول اقتدار کا اصول	۵۶
شیخ کامل کا فیض	۵۷
عنایاتِ خداوندی	۵۹
رئیس الاحرار کا رتبہ، بصیرت اور تقویٰ	۶۲
شکر نعمت	۶۵
انسانی فطرت کی نیرنگی اور اس کی توجہ	"
نیرنگیٔ کردار، منزلیں پانے سے پہلے اور انہیں پانے کے بعد	۶۶
قدرت کی متوازی قوت	۶۷
کارنامہ قدرت	"
سیاہ سامراج کے خطرناک عزائم	۶۸
معجزے کا ظہور	۶۹
بنگلہ دیش .... شر میں خیر کا پہلو	۷۰
مشرقی پاکستان کا نعم البدل	۷۱
ذوق شعری اور اس کا اثر	۷۲
فلسفۂ سیاست اور اس کے حسابی قاعدے	۷۴
سیاست کاروں کا سیاست پر اثر	۷۵
شیخ کامل کی تعریف	۷۶
سکون و اطمینان کی دولت	"

Marfat.com

بے سروسامانی اور قدرت کے کرشمے	۷۷
آزادیٔ فکر کی نعمت اور اس کے اثرات	۸۰
حکومتوں اور حکمرانوں کے ساتھ نسبت	۸۳
بے بصیرت حکمرانوں کا طرز عمل	۸۴
سہالہ لائے جانے کے اسباب	″
مذاکرات سے اعتزاز اور اس کے نتائج	۸۵
مذاکرات کا آغاز	۸۶
وزیر اعظم کی سہالہ میں آمد	″
رابطے کا تاریخی سفر	″
ساتھیوں کا ردِّ عمل	۸۸
کمیونسٹ ہونے کا الزام	۹۰
نازک مزاج شاہان	۹۱
سروسز کا استحصال	۹۲
سی۔ آئی۔ ڈی کا ناقص معلومات و اطلاعات	۹۴
وارنٹ میں تصحیح	۹۵
مرکزی حکومت کی بوالعجبیاں	۹۶
بھارتی اسلحہ کی درآمد	″
ہر کشمیری محب وطن ہے	۹۷
غلط فہمیاں اور بدگمانیاں	″
'پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق'	″
محکمہ سراغرسانی کے کارنامے	۹۸
جسے اللہ رکھے	۹۹
تالیف قلوب یا ضمیروں کے سودے	۱۰۰
جبر و تشدّد اور صبر و استقامت	۱۰۱
مروجہ سیاسی نظام	۱۰۲
بے بس اکثریت میں شعور آزادی	۱۰۳

Marfat.com

زوال اقتدار کا اصل سبب	۱۰۴
حکومتوں کے کرنے کے اصل کام	۱۰۶
تحریک پاکستان کی مقبولیت کا راز	۱۰۷
ظاہری اسباب کا فقدان اور قبول عام	۱۰۸
نفاذ اسلام کے لئے بنیادی شرط	"
ملکی اور قومی سیاست کے بارے میں نظریات	۱۱۰
ہمارے نظریاتی کارکن	۱۱۱
سوشلسٹ کارکن	"
نظریات اور لوگوں کے مسائل	۱۱۲
دوسروں کی پہچان	۱۱۳
حکومت مقصد نہیں ' ایک وسیلہ ہے	"
حاکم اور رعایا کا باہمی تعلق	۱۱۴
اختلاف رائے اور دشمنی میں فرق	۱۱۵
سیاست ایک مقدس مشکل ذمہ داری	۱۱۶
سیاست کے بارے مین عوامی تاثر	۱۱۷
تعاون اور عدم تعاون کا طرز عمل	۱۱۸
اللہ والوں کا طرز فکر ' اصول تعاون کی ایک مثال	۱۲۰
کبر نفس اور تاب سخن	۱۲۱
خیر خواہی کا تقاضا اور اخلاقی جرات	۱۲۲
ذات باری پر غیر متزلزل یقین	۱۲۴
باصلاحیت ملازمین کے ساتھ مرکزی حکومت کا سلوک	۱۲۵
ملک اور قوم پر ظلم عظیم	۱۲۶
ہم سفروں کے ساتھ تعلقات	۱۲۷
اپنوں اور غیروں کے ساتھ عفوو در گزر	۱۲۹
دشمن کے خلاف مؤقف	۱۳۰
اظہار رائے کی آزادی	۱۳۱

Marfat.com

نازک مرحلہ .... گنگا کا اغوا' ۱۳۲
تحریکِ آزادی کے معقول راستے ۱۳۴
آزادی رائے کے تقاضے ۱۳۵
آزادی اور الحاق ۱۳۶
خبروں کی تحقیق ۱۳۷
مرکزی حکومت کے ساتھ تعلقات ۱۳۷
استحکام' حزب اقتدار اور حزب اختلاف ۱۴۰
ایم۔ آر۔ ڈی میں شمولیت اور علیحدگی "
دِلّی کا پانچواں سوار ۱۴۲
حرفِ آخر ۱۴۳
ہماری اصل ضرورت .... صحیح قیادت ۱۴۶
اقتدار کو طول دینے کی خواہش "
میدانِ سیاست ۱۴۸
غلامی کے اثرات اور علاج ۱۴۹
قومی یکجہتی میں فوج کا کردار ۱۵۰
قومی یک جہتی کے لئے جدوجہد ۱۵۱

Marfat.com

Marfat.com

تصاویر

ذوالفقار علی بھٹو اور صاحب زادہ فاروق علی خان	۳۵
خواجہ ناظم الدین مرحوم (سابق وزیر اعظم پاکستان)	۳۹
سردار عبدالقیوم ' عبدالحفیظ پیرزادہ اور ذوالفقار علی بھٹو	۴۵
پروفیسر غفور احمد ' سردار عبدالقیوم اور سردار عتیق احمد	۵۱
سردار عبدالقیوم ' ذوالفقار علی بھٹو اور سردار محمد ابراہیم	۷۹
ذوالفقار علی بھٹو ' مفتی محمود ' نواب زادہ نصراللہ خان ' پروفیسر غفور احمد	۸۷
ایئر مارشل (ریٹائرڈ) محمد اصغر خاں	۸۹
سردار عبدالقیوم خان اور خان عبدالولی خان	۹۳
نواب زادہ نصراللہ خان ' مفتی محمود ' بھٹو ' کوثر نیازی اور عبدالحفیظ پیرزادہ	۱۰۵
جنرل محمد ضیاء الحق	۱۰۹
ذوالفقار علی بھٹو اور کے۔ ایچ۔ خورشید	۱۱۹
سردار عبدالقیوم خان اور جنرل محمد ضیاء الحق	۱۴۷

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تعمیری فکر کم اور تنقیدی بلکہ تخریبی ذہن زیادہ سرگرم عمل رہتے ہیں جن کے ذریعے ایسے ایسے "کار خیر" انجام پاتے ہیں جنہیں دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے۔

ع ۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اسی قسم کا ایک حادثہ بھٹو دور حکومت میں پیش آیا اس دور کے مظالم جب حد سے گزر گئے اور عوام جان بلب ہو کر سڑکوں پر نکل آئے، قومی اتحاد قائم ہوا اور حکومت کے ساتھ تصادم کے باعث اتحاد کے رہنماؤں کو قید کر دیا گیا۔ حالات اس قدر سنگین ہو گئے کہ خاکم بدہن ملک ہی کے خاتمہ کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ بھٹو صاحب ہر قیمت پر برسراقتدار رہنے پر مصر تھے۔ تب ایک ایسا مرحلہ آیا جہاں جبروتشدّد سپرانداز ہو گیا اور بھٹو صاحب قومی زعماء کے ساتھ گفت وشنید اور مفاہمت پر مجبور ہو گئے۔ اس موقع پر جناب سردار محمد عبدالقیوم خان ایک ایسی شخصیت تھے جن کے معتدل اور متوازن دل ودماغ پر اعتماد کی وجہ سے حکومت اور دوسرے قومی رہنماؤں کے درمیان مذاکرات کا راستہ ہموار ہوا۔ چنانچہ اس کام کے لئے نظرانتخاب انہی پر پڑی اور انہوں نے قومی مفادات کے پیش نظر اس اہم فریضہ کو ادا کرنے کیلئے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن یہ کوششیں بوجوہ پوری طرح توبار آور ثابت نہ ہو سکیں اور مارشل لاء تک نوبت جا پہنچی لیکن اس کارِ عظیم کی اہمیت وافادیّت ہماری تاریخ کا ایک سنگ میل ہے۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد بحالی جمہوریت کی تحریک (ایم آر ڈی) کی سرگرمیاں جاری رہیں لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسے حادثات اور واقعات پیش آ گئے جو اعلانیہ طور پر ملک وملت کے مفاد کے منافی تھے۔ سردار صاحب جیسے محبّ وطن کیلئے کسی صورت بھی اس قسم کی تخریبی سرگرمیاں قابل برداشت نہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ان سرگرمیوں سے اپنی براءت کا اعلان کیا اور ایم آر ڈی سے علیحدگی اختیار کی۔

اس پس منظر میں بعض لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کا پیدا ہونا طبعی امر تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بلکہ بعض مخلص محبّ وطن لوگوں نے بھی صورت حال کی وضاحت چاہی۔ لیکن ایسے لوگ بھی موجود

Marfat.com

تھے جو اس وقت کی تلاش میں تھے کہ اس طرح سردار صاحب کی ذات کو طعن و تنقید کا نشانہ بنائیں۔ چنانچہ صاحبزادہ فاروق علی صاحب کا ایک انٹرویو بھی اس قسم کی کارروائی کی نشاندھی کرتا ہے۔

صاحبزادہ صاحب کا حدود اربعہ تو ایسا نہ تھا کہ ان کے انٹرویو کا نوٹس لیا جاتا لیکن معاملہ چونکہ قومی اور اجتماعی نوعیت کا تھا اور ہمارے ہاں ابھی ذہنی پختگی اس درجہ تک نہیں پہنچی کہ لوگ بات سننے کے بعد تصدیق کے لئے اس کی تحقیق کریں۔ لہٰذا سردار صاحب نے اس مضمون میں اپنے ماضی اور حال کی روشنی میں ان الزامات کا جائزہ لیا ہے اور اصل حقائق کی نشاندھی کی ہے۔ یہ مضمون مولانا کوثر نیازی کے نام ایک مکتوب کی شکل میں ہے۔

ہمیں امید ہے کہ معتدل اور متوازن دل و دماغ رکھنے والے مخلص حضرات کے لئے یہ مضمون اکتفاء کرے گا۔ البتہ کج نگاہوں کو اگر دن کی روشنی میں کچھ نظر نہ آئے تو "چشمہ آفتاب را چہ گناہ"

پروفیسر عبدالرزاق

Marfat.com

تمہیدی کلمات

۶ ر ستمبر ۱۹۶۵ء کے دن کو اس کی اپنی مناسبت سے جو منفرد قومی اعزاز اور اہمیت حاصل ہے وہ کسی تبصرے کی محتاج نہیں ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اسی دن یعنی ۶ ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو جبکہ کشمیر میں تحریک آزادی اپنی ابتدائی اٹھان پر تھی، ضلع پونچھ کے ایک معروف مقام باغ میں بھی ایک عجیب سبق آموز اور دلخراش واقعہ رونما ہوا۔ یہ واقعہ جہاں ڈوگرہ فوج کے ظلم و تشدّد کی یادگار ہے، وہاں کشمیریوں کی جرأت ایمانی اور تحریک پاکستان کے ساتھ ان کے والہانہ عشق کی ایک انمٹ یادداشت بھی ہے، ایسی یادداشت کہ اس کے گہرے نقوش کو وقت کا بے رحم ہاتھ بھی مندمل نہ کر سکا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نقش اور زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔

واقعہ یوں ہے کہ جب ۲۷ ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہڈہ باڑی کے مقام پر تحریک آزادی کے متوالوں پر ڈوگرہ فوج نے کسی معقول جواز کے بغیر گولی چلادی تو ہمارا تمام قافلہ منتشر ہو گیا۔ تاہم اس مقام پر جمع ہونے والوں میں کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے ایک نہایت خوبرو، جوان سال اور جذباتی سالار سید خادم حسین شاہ تھے۔ ان کا گھر ہلڑ گاؤں میں ہڈہ باڑی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں ایک بارانی نالہ پڑتا ہے۔ اس ناگہانی فائرنگ کے نتیجے میں نصف درجن کے قریب ہمارے مجاہدین شہید ہو گئے۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے بھی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس نالہ کو عبور کیا۔ راستہ میں سید خادم حسین شاہ کے گھر کے قریب سے گزرے۔ اس وقت وہ اپنی ایک معصوم بچی کو اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کا گھر پر رہنا مناسب نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ خبیث یعنی ڈوگرہ فوجی ان بچوں کی بے حرمتی کریں گے، اس لئے میں تو گھر پر ہی رہوں گا۔ ہم لوگ چلے گئے۔ چند دنوں کے بعد ڈوگرہ فوج نے ان کو گرفتار کر لیا اور باغ لے جا کر ایسی اذیتیں دے کر، جوان کا وحشی دماغ ہی سوچ سکتا تھا، ان کو شہید کر دیا گیا ——— سنا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں جب موت ان کے سامنے تھی، ان سے کہا گیا کہ وہ "پاکستان مردہ باد" کہہ دیں تو ان کو رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ بدستور پاکستان زندہ

Marfat.com

باد ہی کہتے رہے۔ چنانچہ جو بیدردی ان انسان نما کتوں کے ذہن میں آ سکتی تھی' ان کو اسی بیدردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ "خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را"

ان کی یاد میں تقریباً ہر سال چھ ستمبر کو باغ کے مقام پر' جہاں وہ مدفون ہیں' جلسہ وغیرہ ہوتا ہے جس میں مختلف قائدین اور سیاسی سماجی کارکن شرکت کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ اس جلسہ کا اہتمام سید خادم حسین (مرحوم) کے بڑے بھائی اور ہماری معروف سیاسی شخصیت سید حسن شاہ گردیزی کرتے ہیں۔ وہ خود بھی تحریک آزادی کے اولین ارکان میں سے ہیں اور اپنوں اور بیگانوں کے ہاتھوں کئی قسم کی اذیتوں سے گزرتے ہوئے آئے ہیں۔

۶ر ستمبر ۱۹۸۲ء کو سید حسن شاہ صاحب نے حسب سابق سالانہ جلسہ کرنا چاہا تھا۔ ان کا تعلق اس وقت لبریشن لیگ کے ساتھ تھا' جو بذات خود ایک المیہ ہے۔ چونکہ لبریشن لیگ ہمارے ساتھ اتحاد میں شامل نہیں تھی' اس لئے انہوں نے کسی سیاسی شخصیت کو مدعو نہ کیا بلکہ ایک درمیانی راستہ کی صورت میں اس وقت کے ہمارے صدر ایک حاضر سروس بریگیڈیئر محمد حیات خان صاحب کو دعوت دی۔

آزاد کشمیر میں اس وقت سیاسی تلخی کا ماحول اپنے جوبن پر تھا' حیات خان صاحب کے ذہن میں یہ بات بس چکی تھی کہ وہ اب ایسے مقام کے قریب آ گئے ہیں جہاں سے وہ اپنے قریبی حریف سردار محمد ابراہیم خان اور مجھ کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتے ہیں جو بقول ان کے' ان کی زندگی کی آخری آرزو تھی۔ ہمارے ایک صدر کی بھی کیا عجیب آرزو تھی؟ اصل میں ان کو بھٹو صاحب کے وقت میں صدر ہونا چاہئے تھا۔ ترتیب زمانی میں غالباً غلطی ہو گئی تھی۔ بہرحال اس وقت ہماری چار جماعتوں نے ان کے مقابلے کیلئے ایک چار جماعتی اتحاد قائم کر رکھا تھا۔ ان حالات کا آج کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا ماحول تھا۔ اللہ تعالیٰ وہ وقت پھر کبھی نہ لائے۔ سردار محمد ابراہیم خان جو ہمارے بانی صدر ہیں اور ویسے بھی سیاسیات میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں' آزاد کشمیر میں ان کے اور میرے داخلے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ سردار صاحب کے سیاسی مقام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اگرچہ خود ہی اس مقام کو خراب کرنے کیلئے بڑے جتن کئے ہیں' مگر وہ مقام پھر بھی کچھ زیادہ کم نہیں ہو پایا اور میں تو بہرحال جو کچھ ہوں اس کیلئے خدائے تعالیٰ اور اپنے عوام کا شکر گزار ہوں۔ ہم سب لوگ جو سیاسی کارکن ہیں' وہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے ریاست جموں و کشمیر کا ایک حصہ آزاد ہوا جو آج آزاد کشمیر کے نام سے موسوم ہے۔ مگر بدنصیبی دیکھئے کہ اسی آزاد کشمیر میں ہمارے ہی داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ لگائی بھی تو کس نے؟ جس کا اس تحریک آزادی میں ایک ملازم کی حیثیت سے شاید ہی کوئی کردار ہوا ہو۔ حالت تو یہ ہو گئی تھی کہ اگر اس حال میں خدانخواستہ دشمن کوئی نقل و حرکت کرتا تو آزاد کشمیر کو محض ایک قبرستان پاتا۔ یا پھر وہ لوگ جو اسلام اور پاکستان سے بدظن ہو رہے تھے بلکہ کچھ تو متحرک بھی تھے' وہی لوگ دشمن کا سواگت کرتے۔

ایسے تباہ کن حالات میں آزاد کشمیر میں ایک اتحاد معرض وجود میں آیا۔ جس میں ہماری جماعت

Marfat.com

کے علاوہ سردار محمد ابراہیم خان، چودھری نور حسین اور عبدالخالق انصاری کی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ "تنگ آمد بجنگ آمد" والا مرحلہ آن پہنچا تھا۔ ہم نے ستمبر کی پہلی یا دو تاریخ کو چھپائی کے مقام پر ایک میٹنگ کی اور فیصلہ یہ کیا کہ حیات خان کے ساتھ اب مکمل محاذ آرائی کرنا چاہئے۔ چنانچہ پہلے مرحلے میں یہ طے پایا کہ جہاں اور جس جلسہ میں بھی وہ شرکت کریں، ہم سب وہاں چلے جائیں اور اسی جلسہ کو خطاب کریں۔ دوسرے مرحلے میں یہ طے تھا کہ ان کے راستے روک دینا چاہئیں۔ ان دو مرحلوں میں کوئی چھ ماہ کا وقفہ ہونا تھا۔ تاہم چونکہ دو تین دن بعد ہی باغ میں ۶ ستمبر کو سید خادم حسین شہید کا دن منایا جانا تھا، اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ اسی سے آغاز کرتے ہیں۔ وہ اس لئے بھی مناسب سمجھا گیا کہ سید خادم حسین بھی درحقیقت ہمارے ہی ساتھی تھے۔ اس لئے حیات خان سے زیادہ ہمارا حق تھا کہ ہم اس جلسہ میں شرکت کرتے۔ پہلے بھی اس جلسہ میں کئی لیڈر اکٹھے ہوتے آئے تھے۔ اس کارروائی کا نتیجہ ہمیں معلوم تھا مگر ہم اس کیلئے تیار تھے یعنی یہ کہ ہمیں گرفتار کرلیا جائے گا۔

چنانچہ اس پروگرام کا اعلان کر دیا گیا اور تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہمارا خیال تھا کہ سردست اس میں کوئی تشدد نہیں ہونا چاہئے تاکہ تحریک پوری طرح منظم ہو جائے۔ سردار صاحب نے اپنے گھر ڈلاکوٹ سے اپنے چند ساتھیوں سمیت آنا تھا اور میں نے اپنے گھر غازی آباد سے۔ میں نے کوئی ۳۵/۴۰ افراد کو ساتھ لے جانے کیلئے تیار کیا۔ چار تاریخ کو ڈپٹی کمشنر پونچھ میجر محمد نعیم، جو ابھی نئے متعین ہوئے تھے، وہ میرے پاس آئے اور اپیل کی کہ ہم اس جلسہ میں شرکت نہ کریں۔ چونکہ وہ نئے تھے اور تھے بھی پشاور کی طرف کے رہنے والے، اس لئے میں نے ان سے ہر ممکن تعاون کرنے پر آمادگی کی۔ مگر جلسہ میں شریک نہ ہونے والی بات ممکن نہ تھی۔ کیونکہ وقت کم تھا اور ہم ہر جگہ اطلاع نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم نے ان کی ہر بات ماننے سے اتفاق کیا۔ وہ دوسرے دن پھر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ ہمیں چند دن کیلئے قید کر دیں۔ اس پر وہ رضامند نہ ہوئے۔ پھر طے یہ ہوا کہ ہمارا قافلہ پہلے جلسہ گاہ میں پہنچ جائے کیونکہ راستہ ایک ہی تھا۔ دوسرا یہ کہ حیات خان کے خلاف نعرے نہ لگائے جائیں۔ ہم اپنا جلسہ علیحدہ کریں اور حیات خان اپنا جلسہ پہلے برخاست کریں تاکہ ہمارے لوگ ابھی اپنے جلسے میں ہی ہوں تو اچھا ہے۔ یہ بھی طے ہوا کہ ہمارے رضا کار اور پولیس دونوں مل کر درمیانی فاصلہ پر پہرہ دیں گے تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔ جہاں حیات خان جلسہ کرنے والے تھے وہ جگہ ہمارے راستے میں پڑتی تھی۔ اس لئے ہم پہلے وہاں سے گزر کر اپنی جلسہ گاہ میں جانا چاہتے تھے۔ میں نے یہ بھی تجویز کیا کہ حیات خان صاحب اگر دوسرے راستہ سے جلسہ گاہ میں چلے جائیں اور جلسہ بھی شہر کی دوسری طرف کریں تو بھی مناسب ہو گا۔ مگر حیات خان چونکہ کوئی مصالحت نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح ہمارا اور مرکزی حکومت کا تصادم ہو اس لئے وہ راستہ کی تبدیلی پر رضامند نہ ہوئے۔

یہ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد عین اسی دن یعنی چھ ستمبر کی صبح کو ڈپٹی کمشنر پھر آئے اور کہنے لگے

Marfat.com

کہ انہوں نے سردار صاحب کو راضی کر لیا ہے کہ ان کو گھر پر نظر بند کر دیا جائے۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ مجھے بھی گھر پر نظر بند کر دیا جائے۔ انہوں نے غالباً یوں کیا کہ سردار ابراہیم خان سے کہا کہ سردار قیوم صاحب راضی ہو گئے ہیں' اس لئے وہ بھی راضی ہو جائیں اور مجھے کہا کہ وہ راضی ہو گئے ہیں تو میں بھی راضی ہو جاؤں۔ سردار صاحب شاید یہ مصلحت نہ سمجھے یا پھر انہوں نے اس کو معقول عذر سمجھا۔ مگر میں نے ایسی نظر بندی سے انکار کر دیا۔ گھر سے نکل کر سیدھا غازی آباد بازار میں چلا گیا۔ جہاں سے تین چار سوزوکیوں پر کارکنوں کو ساتھ لے جانا تھا۔ اگر ہماری نیت حیات خان کا راستہ روکنے کی ہوتی یا ہم فساد کرنا چاہتے تو پھر اتنی تھوڑی تعداد میں لوگوں کو کیوں بلواتے؟۔ پھر اگر فساد کرنا مقصود ہوتا تو میرے گھر کے پاس کیوں کرتے دوسری خالی جگہیں کیا کم تھیں؟

جب ڈی سی نے دیکھا کہ صورت حال ایسی ہے تو اس بے چارے نے کوشش کی کہ حیات خان کو دھیر کوٹ کے مقام پر آدھ گھنٹہ روک دیا جائے تاکہ ہم لوگ پہلے اپنی جلسہ گاہ میں پہنچ جائیں۔ لیکن ابھی ہم بازار میں پہنچے ہی تھے کہ ہوٹر کی آواز آئی اور ساتھ والے موڑ سے حیات خان آ نکلے۔ ڈی سی بھی پریشان ہو گیا اور تھا بھی پٹھان۔ دو چار سنا بھی دیں۔ ہم بھی راستے میں ڈٹ گئے۔ پھر جو کچھ ہوا وہ ایک لمبی تفصیل ہے۔ البتہ حیات خان مصر ہو گئے کہ ہمیں باغ جانے سے قطعاً روک دیا جائے۔ چنانچہ اس کارروائی میں پورا دن صرف ہو گیا اور پھر شام کے قریب جب میں نے دیکھا کہ اب حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے' تب میں نے گرفتاری دے دی اور اپنے کارکنوں کی منت سماجت کر کے میں چلا گیا اور حیات خان کوئی چھ سات گھنٹے کی تاخیر سے رات کے وقت باغ تشریف لے گئے اور جلسہ سے خطاب کیا۔

وہاں مجھے پہلے چکار پھر لوہار گلی اور پھر مظفر آباد دارالحکومت کے عین سر پر "میرا سرو" نامی جگہ میں پی ڈبلیو ڈی والوں کی ایک ہٹ میں جار کھا۔

سردار صاحب' چودھری نور حسین اور انصاری صاحب بھی گرفتار ہو گئے اور ہمارے متعدد دوسرے کارکن بھی۔ بہرحال یہ تھا وہ تحفہ جو حیات خان جیسے "صاحب بصیرت" شخص نے چھ ستمبر کے قومی دن کے موقع پر قوم کو عطا فرمایا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ روزنامہ "جنگ" کے کسی رپورٹر نے صاحبزادہ فاروق علی کا کوئی انٹرویو لیا اور قومی اتحاد کے خلاف بالعموم اور میرے خلاف نام لیکر کچھ الزامات کا تذکرہ کیا۔ میں نے وہ الزامات تو پڑھے نہیں۔ البتہ مولانا کوثر نیازی صاحب نے ان کا جو جواب لکھا اس کے بارے میں ایک دوست نے مجھے وہیں جیل میں بتایا۔ اخبار پر تو پابندی تھی اس لئے وہاں تو وہ موقع میسر نہ آیا۔ لیکن مولانا نے جو کچھ لکھا تھا' اس سے الزامات کا بھی اندازہ ہو گیا اور جو کچھ مولانا نے لکھا تھا وہ بھی سمجھ میں آ گیا۔

مولانا کوثر نیازی صاحب پی پی پی کے دور حکومت میں وزیر ہی نہیں بلکہ وزیر باتدبیر سمجھے جاتے تھے اور فی الواقع تھے بھی۔ مگر اس عذاب خانے میں ہونے کے باوجود ان کا میرے ساتھ مروّت اور بھائی چارے کا رشتہ برابر قائم رہا۔ یہاں تک کہ ان پر اس وجہ سے عتاب بھی نازل ہوتا رہا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے'

Marfat.com

اس نظام کی اپنی مجبوریوں کو چھوڑ کر مولانا نے خلوص نیت سے یہ کوشش کی کہ بھٹو کے کاموں میں توازن پیدا ہو اور وہ ایک اچھا حکمران ثابت ہو۔ مگر اس نظام کی ایک مجبوری یہ تھی کہ وہ اصلاح سے بالاتر تھا۔ صُلح جوئی اور اصلاح پسندی تو ان کی لغات میں ہی نہ تھی۔ مگر مولانا کی چونکہ اپنی ایک خاص افادیت تھی، اس لئے بداعتمادی کے باوجود مولانا کو ساتھ رکھنا پڑا۔ اس کے علاوہ مولانا رازہائے درون خانہ سے واقف کار افراد میں سے بھی تھے۔ کافی حد تک ان رازوں کے امین بھی۔ اس لئے انہوں نے صاحبزادہ کے جواب میں جو کچھ لکھا، وہ ان کی اپنی معلومات، دیانت و امانت کا تقاضا تھا۔ میرے ساتھ مروّت کے رشتہ کا تقاضا بھی یقیناً یہی تھا۔ مولانا نے مجھے یہ بھی سنایا کہ بعد میں کسی وقت صاحبزادہ نے ان الزامات سے براءت کا اظہار کیا۔ یا اس نوعیت کی بات کی۔ بہرحال میرے نزدیک وہ الزامات یا اس قسم کی خرافات ہماری زندگی کا تقریباً روزمرّہ بن گئی ہیں۔ اس لئے اب کسی کو اس سے غرض نہیں رہی کہ کس نے کیا خرابی کی۔ بلکہ اب تو الزام یہ ہونا چاہئے کہ کس نے خرابی کیوں نہیں کی؟

میں نے مولانا کو جوابا جو خط لکھا ہے وہ بھی کسی براءت کی خواہش سے نہیں بلکہ جیسا کہ خود خط سے ظاہر ہے، اس موقع سے استفادہ کر کے کئی دوسرے اہم موضوعات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ تاہم جن دنوں میں نے یہ خط لکھا، یہ وہی دن تھے یعنی ستمبر کے اوائل اور ساری فضاء تلخیوں سے زہر آلود تھی۔ تلخی کی شدّت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صدر پاکستان کی دعوت پر میں ان سے ملنے راولپنڈی گیا تو کسی بات پر بات اتنی بڑھی کہ میں نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور واہی تباہی کہتا ہوا واپس جیل چلا گیا۔ اس لئے اگر اس تحریر پر ان حالات کا اثر ہو تو وہ حالات کا عین فطری تقاضا ہے۔ بلکہ اگر ان حالات کا اثر نہ ہوتا تو یہ غیر فطری بات ہوتی۔ اس تلخی کا کچھ اندازہ اس واقعہ کی تفصیل سے ہو سکتا ہے۔

جناب خان روائیداد خان مظفر آباد میں میری نظر بندی کے دوران میرے پاس آئے اور مجھے پیغام دیا کہ صدر پاکستان مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے راولپنڈی بلا رہے ہیں تو میں نے ان سے استفسار کیا کہ صدر بالآخر مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟ مقصد کیا ہے؟ مجھے جواب ملا کہ وہ یعنی صدر صاحب آزاد کشمیر کے معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں اور میرے مشورے سے کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی۔ میں نے خان صاحب سے کہا کہ کوئی انقلاب تو نہیں آ گیا؟۔ یہ تبدیلی کیسے واقعہ ہو گئی؟ اگر پالیسی اس قسم کی ہوتی تو آزاد کشمیر میں سرے سے کوئی تلخی ہی نہ ہوتی دوسرا میں نے سنا ہوا تھا کہ صدر پاکستان کچھ کشمیری رہنماؤں سے ملنے والے ہیں۔ اس لئے میں نے پوچھا کہ اور کس کس سے مل رہے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ صرف مجھ سے ملیں گے۔ ایک اور سوال تھا جو پوچھنا ضروری تھا کہ میرے جو دوسرے ساتھی قید ہیں خاص کر تین جماعتوں کے لیڈر یعنی سردار ابراہیم خان، چودھری نور حسین اور عبدالخالق انصاری تو ان کے ساتھ میری ملاقات کا کیا ہو گا۔ کیونکہ میں انکے مشورے کے بغیر تو بہرحال صدر صاحب کو نہیں مل سکتا۔ اس پر پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ میری ملاقات کیلئے ضروری نہیں ہے کہ میں سب کے ساتھ مشورہ کروں۔ جب بات طے ہو رہی ہے تو خود بخود سب کو علم ہو جائے گا۔ لیکن جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے کہ میں سردار ابراہیم خان صاحب کے ساتھ بے شک مل سکتا ہوں۔ مجھے

Marfat.com

بہتر مفادات کی خاطر یہ کڑوی گولی بھی کھانا پڑی۔ وہ تو اسی دن چلے گئے۔ مجھے دوسرے دن رہا کرنے کیلئے ڈی۔ آئی۔ جی حمید اللہ خان آ گئے۔ کہنے لگے کہ آپ کو پیرول پر رہا کیا جا رہا ہے آپ اس کاغذ پر دستخط کر دیں۔ یہ کاغذ رہائی کیلئے ایک طرح کی درخواست تھی۔ میں نے انکار کر دیا کہ میں پیرول پر رہا نہیں ہوں گا۔ البتہ مجھے رہا کر دیں یا بطور قیدی لے جائیں اور واپس لے آئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اب تک صحیح طور پر معلوم نہیں کہ کاغذات میں ان لوگوں نے کیا لکھا تھا۔ تاہم مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ گاڑی مہیا کی گئی اور سردار محمد ابراہیم خان صاحب کے ساتھ ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ میں سردار صاحب سے مل کر راولپنڈی چلا گیا۔

راولپنڈی پہنچنے پر اطلاع ملی کہ شام کو صدر صاحب سے ملاقات ہے۔ اسی اثناء میں ہماری جماعت کے صدر سردار سکندر حیات خان کا فون آیا اور انہوں نے پوچھا کہ کیا انہیں بھی صدر صاحب سے ملنے کیلئے چلنا ہے؟ مجھے تو چونکہ معلوم تھا کہ صرف مجھے ہی بلایا گیا ہے اس لئے میں نے ان سے یہی کہا۔ لیکن جب میں صدر صاحب کے ہاں پہنچا تو میں ہی پہلا شخص تھا۔ انتظار کیلئے اے ڈی سی کے ہاں بیٹھا ہوا تھا تو اے ڈی سی نے پوچھا کہ سردار سکندر نہیں آئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے ان کو بھی بلایا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ "ہاں"۔ ان کو بھی آپ کے ساتھ ہی صدر صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے کہا کہ انہیں فون کریں۔ پھر میں نے احتیاطاً اے ڈی سی سے پوچھا کہ اور کون کون ہیں؟۔ جنہیں صدر صاحب سے ملنا ہے، تو انہوں نے بتایا کہ کافی لوگ ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو بقول ان کے وہ جانتے بھی نہ تھے۔ اس پر مجھے خان روئیداد خان والا معاملہ بھی کچھ ایک سوچا سمجھا ڈرامہ دکھائی دیا۔ اتنے میں خان روئیداد خان اور چند وزراء بھی آنے شروع ہو گئے۔ میں نے خان روئیداد خان سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے اور کیوں مجھے غلط بات کہہ کر بلایا گیا ہے؟

اس سے پہلے کہ یہ سب وزراء کرام آتے، میں نے اے ڈی سی سے ناراضگی سے کہا کہ مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا بات اس کے برعکس ہے۔ اس لئے اپنے صدر سے کہہ دو کہ میں ان سے نہیں ملوں گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی کھیل تماشا نہ تھا۔ اتنے میں وزراء کرام آنے شروع ہو گئے اور ہماری گفتگو کافی تلخ ہو گئی۔ ان بے چاروں نے کچھ نہیں کہا۔ غالباً ان کو خود بھی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میٹنگ محدود نہیں تھی تاہم میرے لئے تو اپنے ان باقی ساتھیوں کو چھوڑ کر جو قید تھے صدر صاحب سے ملنا ممکن نہ تھا۔ میری اس بات کا یقین کس کو آتا کہ صرف مجھے ہی بلوایا گیا ہے؟ اتنے میں جنرل عارف صاحب تشریف لائے اور مجھے باہر برآمدے میں لے گئے۔ بقیہ حضرات میں سے خورشید صاحب بھی اس عرصہ میں آ چکے تھے اور انتظار کر رہے تھے۔ باہر برآمدے میں جا کر میں نے جنرل عارف صاحب کو بات سنائی اور اپنی مشکل بھی بتا دی تو انہوں نے کہا "اچھا ہم سردار ابراہیم خان کو بھی بلوا لیتے ہیں"۔ مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ "میں تو ایسی صورت حال میں صدر صاحب سے قطعاً ملاقات نہیں کروں گا"۔ اسی بات کے دوران راجہ ظفر الحق صاحب اور سکندر صاحب بھی آگے پیچھے آ گئے اور ہم چاروں برآمدے میں بات کر رہے تھے۔

Marfat.com

جنرل عارف صاحب نے تو سردار سکندر سے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ "میری رائے آپ کی رائے کے ساتھ ہے" اور اٹھ کر چلے گئے۔ راجہ صاحب زور لگاتے رہے مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب یاد نہیں کہ جنرل عارف صاحب نے یا راجہ صاحب نے کہا کہ اندر جا کر صدر صاحب کے ساتھ مصافحہ ہی کر لیں اور پھر بے شک چلے جائیں۔ میں نے تلخی سے کہا کہ "کیا ان کے ساتھ مصافحہ کرنے سے آخرت میں میری بخشش ہونی ہے؟ میں اندر نہیں جاتا"۔ اس پر راجہ صاحب نے کہا "اچھا صدر صاحب خود باہر آ کر آپ سے ملیں گے اور اندر لے جائیں گے"۔ اس سے بھی میں نے انکار کر دیا۔ قابلِ غور۔۔۔۔۔

بات ہے کہ صدر صاحب از راہ مروّت خود باہر آ کر مجھے ملنا چاہتے ہیں اور ہماری طرف سے تلخیوں کا یہ عالم ہے کہ میں اس سے بھی انکار کر رہا ہوں۔ سردار سکندر صاحب نے راجہ صاحب سے کہا کہ یہ نامناسب ہے۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کر چلا آیا۔ بر آمدے سے باہر نکلا تو آگے خان روئیداد خان اور فخر امام کھڑے تھے۔ میں نے روائیداد خان سے کہا کہ "آپ نے اچھا نہیں کیا"۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ بہرحال وہ تو چپ رہے مگر فخر امام نے کہا کہ سردار صاحب آپ نے موقع نہیں دیا ورنہ آپ دیکھتے کہ بات کیا ہے؟ میں نے غصہ میں کہا کہ آپ لوگ مجھے قید تو کر سکتے ہیں مگر میری بے عزتی کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ وہ کچھ نہ بولے اور میں واپس کا کاجی ہاؤس چلا آیا۔ میں نے کچھ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اسی وقت رات کو میں نے بی بی سی کے نمائندے کے ساتھ رابطہ کیا اور صدر سے ملاقات والا سارا واقعہ سنایا۔ جو غالباً اسی دن یا دوسرے دن بی بی سی سے براڈ کاسٹ ہوا۔ واپسی پر میں جیل میں حاضری دینے سے قبل سردار ابراہیم صاحب کے پاس گیا اور ان کو پوری روئیداد سنائی۔ پھر اسی شام کو ڈھلی بازار میں جلسہ عام کیا جو تقریباً خود بخود جلسہ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میں نے اس میں بھی جتنا غصہ نکال سکتا تھا نکالا۔ البتہ جب میں راولپنڈی سے واپس آ رہا تھا تو مظفر آباد اور کوہالہ کے درمیان کسی جگہ پی پی کے ایک معروف رکن مجھے ملنے آئے تھے۔ بہت خوش تھے اور مجھے صدر کے ساتھ نہ ملنے پر مبارکباد دے رہے تھے۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ شاید میں نے وہ بات درست نہیں کی۔ کیونکہ پی پی والوں کا مقصد وحید صرف یہی رہا ہے کہ صدر ضیاء الحق کے ساتھ جس قدر ہو سکے دشمنی کی جائے۔ حالانکہ میری بات بالکل دوسری تھی۔ تلخی اس فضاء میں تھی اور یہ تلخی آزاد کشمیر کے صدر نے اپنی غرض کیلئے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے پیدا کی تھی۔ ورنہ صدر پاکستان کے ساتھ میری کوئی براہ راست مخالفت یا دشمنی نہیں تھی۔

بہرحال اس کے بعد بھی میں کافی دیر جیل میں رہا حتیٰ کہ جنرل عبدالرحمان صاحب صدر آزاد کشمیر کی حیثیت سے آ گئے۔ ان کے پیشرو کا آخری بیان بھی عجیب تھا اور ان کی "عالی ظرفی" کی عکاسی کرتا تھا۔ کسی رپورٹر نے ان سے پوچھا کہ آپ جا رہے ہیں تو سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیں تو جواب میں انہوں نے کہا کہ جب تک وہ صدر ہیں، کسی ایک کو رہا نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ جب جنرل عبدالرحمان صدر بن گئے تو انہوں نے ذاتی طور پر تکلیف کی اور مجھے جیل سے رہا کرانے کیلئے خود تشریف لائے اور

Marfat.com

اسطرح تلخیوں کا وہ دور ختم ہو گیا۔ جنرل عبدالرحمان نے مجھے اسی دن بتایا کہ شاید وہ اپنی مرضی سے مجھے ملنے جیل میں نہیں آسکتے تھے۔ لیکن انہیں بطور صدر نامزد کرنے کے بعد پہلی بات جو صدر پاکستان نے ان سے کہی تھی وہ یہ تھی کہ "سردار قیوم کا خیال رکھنا۔ انہیں رہا کرنا ہے"۔ میں اس ضمن میں ان تمام دوست واحباب کا بے حد شکر گزار ہوں جو ایک طرف صدر ضیاء صاحب کے معتمد تھے تو دوسری طرف مجھ پر بھی بے حد مہربان تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے میرے بارے میں صدر صاحب کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ ہماری جو تصویر کشی آزاد کشمیر کے صدر نے کر رکھی تھی 'اس کے پیش نظر تو ہم سے بڑا مجرم اس پورے ملک میں کوئی نہیں تھا۔

ایک وضاحت ضروری ہے میں نے ملاقات کے دوران خان روئیداد خان کو بتایا تھا کہ میں ان کو ایک نہایت اعلیٰ پائے کا شخص سمجھتا ہوں اور ان کی بات پر اعتماد کرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بات غلط ہو تو بعد میں پریشانی ہو۔ مجھے کسی غلطی کا علم تو نہیں تھا مگر میرے دل میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ چنانچہ جب اس بات کا ایک حصہ بظاہر غلط ثابت ہوا تو میری تلخی حق بجانب تھی۔ اگرچہ بعد میں معلوم ہوا کہ خان روئیداد خان کو فی الواقع دوسروں کے بلوائے جانے کا علم اس وقت نہیں تھا جب وہ مجھے ملے۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ اگر اس دن میری ملاقات ہو جاتی تو وہ تلخی کا دور چند دن یا چند ہفتے پہلے ختم ہو جاتا۔ یہ بھی طے شدہ تھا مگر اس حقیقت کی کیا تاویل کریں کہ کُلّ اَمرٍ مَرھُونٌ بِوَقتِہٖ (ہر معاملہ اپنے وقت کا مرہون ہے)۔

چند واقعات اور امور ایسے ہیں کہ مجھے ان کے بارے میں بظاہر بہت پہلے اپنی معلومات کو قلمبند کرنا چاہئے تھا، مگر شاید اس کا ابھی وقت نہ آیا ہو یا اس کیلئے کوئی مناسب محرک موجود نہ ہو۔ اس تحریر کا سبب بھی ایک حادثہ یا اتفاقی واقعہ ہے۔ ۱۹۸۲ء کے ستمبر کی ۸ یا ۹ تاریخ کو جبکہ میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں قید تھا مجھے "جنگ" اخبار کا ایک پرچہ ملا۔ اخبارات ملنے پر اگرچہ ابھی پابندی تھی مگر جیل خانوں کی اپنی ایک الگ دنیا اور ایک الگ ریت ہوتی ہے۔ ان کی اپنی روایات ہیں جو ہر دور حکومت میں بہت حد تک باقی رہتی ہیں۔ ان پر جیل کی چار دیواری سے باہر کی تبدیلیوں کا اثر بہت کم ہی ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پابندی والی اشیاء میں سے کوئی بھی ایسی شے نہیں جو جیل کے اندر دستیاب نہ ہوتی ہو بلکہ ہمارے مرحوم قائد رئیس الاحرار چودھری غلام عباس مرحوم نے اپنی کتاب میں اس ضمن میں ایک نہایت خوبصورت بات لکھی ہے کہ "اگر جیل خانہ کا دروازہ بڑا ہو تو ہاتھی بھی اندر لایا جاسکتا ہے"۔ بالکل اسی طرح یہ پرچہ بھی مجھے نہ صرف پابندیوں کے خلاف ملا بلکہ خود پابندی لگانے والوں نے ہی خفیہ طور پر یعنی پابندیوں کا بظاہر احترام قائم رکھتے ہوئے مہیا کیا۔ اس پرچے میں مولانا کوثر نیازی کی تحریر "مشاہدات و تاثرات" کو نشان زد کیا گیا تھا تاکہ میں اس کو ضرور پڑھوں۔ اس کالم میں مولانا کوثر نیازی نے صاحبزادہ فاروق علی کے ایک اخباری انٹرویو میں میرے بارے میں بیان کئے گئے بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ میں نے صاحبزادے کا اصل بیان تو پڑھا نہیں مگر مولانا کوثر نیازی کی تحریر سے بہت واضح تھا کہ صاحبزادہ نے کیا کہا

81668

Marfat.com

ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صاحبزادہ نے "اپنے ہی الفاظ میں سہی" کہا ہو کہ قومی اتحاد کے رہنماؤں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو دوران خانہ اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ بلکہ یہ کہ وہ سابق وزیراعظم کو قومی اتحاد کی کارروائی سے باخبر رکھتے تھے جس کا ان کو معاوضہ ملتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس میں سے بعض کے نام بھی لئے جس میں میرے نام کا ذکر بھی ہو گا واللہ اعلم .... "مگر مولانا کوثر نیازی کا جوابی بیان اور اس الزام کی تردید اس قدر واضح اور کافی تھی کہ کسی مزید تحقیق اور تجسس کی ضرورت تھی نہ وضاحت کی۔ میں نے جب مولانا کا یہ کالم پڑھا تو مجھے معاً یاد آیا کہ کچھ صاحبزادہ فاروق علی پر ہی موقوف نہیں، یہ بات تو حکومت کے ایوان سے بھی کئی بار سنی جا رہی تھی، اور نہایت اعلیٰ مقام پر فائز بعض حضرات نے اپنے دوستوں کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ معاملہ واقعی ایسا تھا۔ میرے بارے میں تو خاص طور پر الزام تراشی کی گئی ہے۔ جن لوگوں سے یہ کہا گیا، وہ سب تو مجھے اتنے قریب سے جانتے نہیں تھے کہ وہ اس کی تردید کر سکیں۔ مگر میرا یقین ہے کہ جو لوگ مجھے قریب سے جانتے ہیں انہوں نے مولانا کی طرح ہی جرأت ایمانی سے یقیناً کام لیا ہو گا۔ تاہم اس رابطہ سے مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ صاحبزادہ فاروق علی سے یہ خصوصی انٹرویو دانستہ طور پر کروایا گیا ہو گا، یہ محض کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔

مولانا کوثر نیازی صاحب نے جنگ میگزین میں انٹرویو پڑھنے کے بعد جو جواب اپنے کالم "مشاہدات و تاثرات" (جنگ ۱۳ر ستمبر) میں دیا۔ اسے پڑھ لیا جائے تاکہ ابتدائی باتیں سامنے آ جائیں۔

۳ ستمبر ۸۲ء کے جنگ میگزین میں کالعدم قومی اسمبلی کے سابق سپیکر اور ایک محترم سیاسی شخصیت صاحبزادہ فاروق علی خان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ جس کے ایک پیراگراف میں میرا بھی ذکر ہے۔ پبلک لائف میں اپنی مدح و ذم میں اتنا کچھ پڑھ سن لیا ہے کہ اب طبیعت اس سے مخالف یا موافق کوئی اثر قبول نہیں کرتی۔

انٹرویو کے اس حصہ سے بالواسطہ ایک قومی خادم کے کردار پر ایسے چھینٹے پڑتے ہیں جن کی صفائی میرا فرض ہے۔ پہلے انٹرویو کا وہ حصہ ذہن میں تازہ کر لیجئے، صاحبزادہ سے سوال جواب کا یہ سلسلہ یوں چلتا ہے۔

> "س ...... ! لوگوں میں یہ تاثر بھی موجود ہے کہ آپ کی حکومت نے تحریک کے دوران کچھ رہنماؤں سے ساز باز کر رکھی تھی؟
>
> ج ...... ! سوائے ایک آدھ واقعہ کے جو مشہور ہوا اور کسی سے کوئی بات میرے علم میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ حکومت نے اس چیز کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، کیونکہ یہ بات حکومت کے علم میں تھی کہ تحریک کسی فرد یا

Marfat.com

جماعت کے قابو میں نہیں ' اس کے پیچھے عوام کی قوت ہے جو اسے چلا رہی ہے اور عوام کے ساتھ ایسے معاملات طے کر کے تحریکوں پر قابو پانا کسی بھی حکومت کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں کسی پر بدظنی کرنے کی ضرورت نہیں ' اتنی بات میرے علم میں ضرور ہے کہ سردار قیوم صاحب کا مولانا کوثر نیازی سے میل جول تھا میں نے خود بھی ان کو مولانا کے ساتھ دیکھا ہے۔

س...... ! صرف ساتھ دیکھنے سے تو یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ویسے خود مولانا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج...... ! مولانا کوثر نیازی میرے دوست ہیں ' اچھے دوست ہیں۔ پچھلے دنوں ملاقات میں انہوں نے بہت سی باتوں میں رائے تبدیل کرنے پر بھی آمادہ کر لیا۔ بھائی ! ان کے متعلق کچھ نہ لکھئے گا۔ قلم اٹھا لیں (باتیں تو ہوئیں لیکن آف دی ریکارڈ)

س...... ! وہ سردار صاحب والی بات تو بیچ میں رہ گئی آپ نے صرف ساتھ دیکھا ہے یا کوئی اور بات بھی ہے؟

ج...... ! بہت سی باتیں ہیں ' حکومت کے ذرائع ہوتے ہیں ' طریقے ہوتے ہیں۔

س...... ! ایسے معاملات ریکارڈ پر موجود ہوتے ہیں؟

ج...... ! ریکارڈ پر کچھ بھی نہیں ہوتا...... " سیکرٹ فنڈ کا کوئی ریکارڈ یا حساب نہیں ہوتا "۔

میں صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے برملا میری دوستی کا اعتراف اعلان کیا لیکن ان کے انٹرویو سے سردار عبدالقیوم خان کے بارے میں جو تاثر ابھرتا ہے ' ریکارڈ کی درستی کیلئے مجھے اس کی بھرپور تردید کرنی پڑے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ سردار عبدالقیوم خان بھی صاحبزادہ فاروق کی طرح میرے دوست ہیں اور عزیز دوست ' مگر ان کی اور میری دوستی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ وہ ہمارے زمانہ حکومت کی پیداوار نہیں ' آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے قائد آج کل سردار صاحب ہیں ' اس کے بانی چودھری غلام عباس مرحوم تھے اور خود ان سے بھی میرے نیازمندانہ مراسم تھے۔ وہ میرے قیام لاہور کے زمانے میں میرے غریب خانے پر بھی دو تین دفعہ تشریف لا چکے ہیں۔ یہیں سے سردار صاحب سے دوستی کا آغاز ہوا اور اب اس دوستی کو کوئی ربع صدی کا زمانہ ہو رہا ہے۔ میں نے اس طویل مدت میں سردار صاحب کو بہت قریب

Marfat.com

سے دیکھا ہے۔ وہ ایک مخلص اور درد مند رہنما اور ایک کھرے اور سچے پاکستانی مسلمان ہیں۔ قومی زندگی میں کسی رہنما کو بخشا گیا ہے جو سردار صاحب کو بخشا جاتا۔ ان کے بارے میں بھی یار لوگوں نے ہر طرح کی دھول اڑانے کی کوشش کی ہے مگر چاند پہ تھوکا اپنے ہی چہرے پر آتا ہے۔ اس سے چاند کا کچھ نہیں بگڑتا۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ہمارے زمانہ میں سردار صاحب کو کیا کیا پیشکشیں نہیں ہوئی تھیں مگر انہوں نے کبھی بھی اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے ہمارے کہنے پر اور بھٹو مرحوم کی بار بار کی درخواستوں کے نتیجے میں پی این اے کو مذاکرات کی میز تک لانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن اس میں ان کے سامنے ملک وملّت کے مفاد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مذاکرات میں ایک نزاعی مسئلہ آزاد کشمیر کی حکومت کا بھی تھا۔ حکومتی ٹیم کی طرف سے اس کے لئے مجھے بااختیار کیا گیا کہ میں سردار صاحب سے اس مقصد کیلئے مذاکرات کروں، جنھیں پی این اے نے اس سلسلے میں اپنی طرف سے نامزد کیا تھا۔ یہ ہمارے خیالات کی ہم آہنگی ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم دونوں چند گھنٹوں کی بات چیت کے بعد مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر متفق الرائے ہو کر اٹھے۔ مذاکرات کے اختتامی جلسے میں ایک دفعہ پھر سردار صاحب اپنے درد دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے پاس آئے۔ یہ مارشل لاء کے نفاذ سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے بتایا کہ

> "فوج اقتدار پر قبضہ کرنے والی ہے۔ بعض عناصر اس سلسلے میں پخت وپز کر رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو کو کہیں کہ وہ فوری طور پر مذاکرات کے سمجھوتے پر دستخط کر دیں اور اس سلسلے میں اچھا ہو گا اگر وہ آج ہی مجھ سے اور مفتی محمود (مرحوم) سے مل بھی لیں"۔

میں انہیں نیچے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اوپر اپنے کمرے میں آیا' اسی روز ایک گھنٹے کے بعد کابینہ کا اجلاس ہونے والا تھا میں نے گرین فون پر بھٹو مرحوم سے بات کی اور انہیں سردار صاحب کا پیغام پہنچایا۔ ان کا ردّ عمل یہ تھا کہ یہ لوگ مجھ سے انٹرویو لینے کے لئے ایسی باتیں کر رہے ہیں .... کاش! ان کا ردِ عمل یہ نہ ہوتا وہ سمجھوتے پر دستخط کرنے میں تاخیر نہ کرتے تو آج ملک کو اتنا طویل مارشل لاء نہ دیکھنا پڑتا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سردار صاحب سے میری دوستی برحق' قومی معاملات میں حکومت کو اس طرح کے مشورے دینے کی ان کی ہمیشہ کی عادت اور روایت بھی بجا لیکن حاشا وکلا کہ اس سے ان کا مقصد کبھی ذاتی مفاد تھا۔ صرف اور صرف ملک اور ملت کی بہتری تھی۔"

صاحبزادہ نے نہ اس سے پہلے کبھی زبان کھولی نہ بعد میں۔ صاحبزادہ بیچارہ تو پی پی کے حادثۂ حکومت کی پارلیمان کا سپیکر تھا جن کا ویسے بھی نہ یہ منصب تھا نہ معلومات جیسا کہ میں نے نفس مضمون میں بھی ذکر کیا ہے۔ اس لئے اس معاملہ پر باوجود اس کے کہ مولانا کوثر نیازی نے بہت شافی جواب دیا تھا اور مولانا کے

Marfat.com

علم وفضل ، زور قلم اور اندرونی حالات سے باخبری محتاج بیان نہیں ہے ، مجھے خود اس موضوع پر کچھ کہنے کی ضرورت شدّت سے محسوس ہوئی۔ اس لئے بھی کہ یہ معاملہ محض میری ذات تک محدود نہیں۔ مجھے اپنی صلابت کردار کے بارے میں کسی حکومت ، کسی فرد یا کسی ادارے کے سرٹیفکیٹ کی احتیاج تھی نہ ہے۔ وہ توجو ہے وہ ہے۔ جس طرح کچھ لوگوں کو تو میری ہربات اور ہرادا بری لگتی ہے بلکہ ان کیلئے تو کسی بات کے برا ہونے کی صرف اتنی دلیل کافی ہے کہ یہ بات سردار قیوم نے کہی ہوگی۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو میری ہربات درست اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہ معاملہ چونکہ قومی اتحاد کی عظیم اور نظام مصطفےٰ کی مقدّس تحریک ، اس کے رہنماؤں کی ذات اور ان کے قومی کردار اور خود ہماری قومی سیاست کے گہرے اندرونی معاملات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور خاص طور پر اس دور کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جس میں بلا امتیاز ٹھوک کے بھاؤ تمام مخالف سیاست دانوں کی کردار کشی کو ایک قومی فریضہ سمجھا جارہا ہے اس میں پہلے لوگوں سے جو کسر رہ گئی تھی ، وہ بھی پوری کر دی گئی اور اس فن کو کمال تک پہنچادیا گیا اس لئے مجھے ضروری معلوم ہوا کہ میں خود اس پر کچھ تفصیل کے ساتھ لکھوں بلکہ میرا یہ اخلاقی و قومی فریضہ ہے کہ میں اس بارے میں اپنے خیالات ، رائے اور معلومات کا ذکر کروں ، خصوصاً اپنے بارے میں۔ کیونکہ اگر صرف میں ہی ایک غلط آدمی تھا ، تب بھی قوم کے ان باقی ماندہ رہنماؤں کے کردار پر میری وجہ سے حرف آ سکتا تھا جو قومی اتحاد میں شامل تھے۔ اس لئے درحقیقت یہ اپنی نہیں بلکہ ان کی صفائی پیش کرنے کا فریضہ ہے۔

حکومتوں کی جانب سے سیاستدانوں کی کردار کشی دانستہ ہو یا غلط اطلاعات کی بنیاد پر ہو ، ہماری زندگی کا ایک لاینفک جزو بن گئی ہے۔ اب نہ تو غلط اطلاعات کی کمی ہے نہ دانستہ کردار کشی کی۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے بجائے دشمنی پر محمول کر لینا اور پھر دشمنوں کی طرح لڑنا کہ لڑائی میں ہربات جائز ہے ، ایک معمول بنتا جارہا ہے۔ اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا اور ہو گا۔ اس سے مجھے اپنے ملک میں جاری و ساری ایک پورا نظام اور اس میں رونما ہونے والے متعدد واقعات ایک ایک کر کے یاد آ گئے۔ ہمارے ہاں ایک پورا نظام اس بات کیلئے وقف ہے کہ حکومت اور محبّ وطن عناصر کے درمیان جنگ آزمائی کی کیفیت کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کیلئے وہ نظام جھوٹی اور من گھڑت اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے اور وہ لوگ جو اوپر ہوتے ہیں وہ ان ہی افسانوں کی بنیاد پر کارروائی کرتے رہتے ہیں۔ اس تمام کارروائی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس ملک کی مخالفت کا اس سے بڑھ کر مؤثر کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں حکمرانوں کو براہ راست کوئی علم تو ہوتا نہیں ، اس لئے ان کو اسی نظام اطلاعات پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔ اس نظام میں ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ بھی ذمہ داری کے مختلف عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں جن کی وفاداریاں پاکستان کے بجائے کہیں اور ہوتی ہیں۔ یا یہ کہ وہ اس پاکستان کو کسی اور شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اسی قسم کی اطلاعات مہیا کرتے ہیں۔ اس کی کوئی ایک نہیں ، درجنوں نہایت ہی اہم مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ خدا کی شان دیکھئے کہ ہر محکمہ میں لوگوں کی کبھی کبھار

Marfat.com

غلطیوں کے باعث گرفت ہوتی ہے۔ مگر ہم نے نہیں سنا کہ اس خاص محکمہ میں کبھی کسی سے پوچھا تک گیا ہو کہ تم نے اتنی بے بنیاد اور من گھڑت خبریں کیوں دیں۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جھوٹی رپورٹ دینے والے کو شاباش دی جاتی ہے۔ جس طرح محاذ جنگ سے کئی بھاگنے والوں کو اعلیٰ اور امتیازی تمغے دیئے جاتے ہیں۔ میرے اور مرکزی حکومت کے مابین اس ایجنسی کی پیدا کردہ جنگ کی داستان بے حد طویل ہے۔ جس کو اس تحریر میں نہیں سمویا جاسکتا۔

موجودہ دور حکومت میں بھی تو یہ کارروائی ایک شاہکار ہے۔ موجودہ حکومت نے جو کچھ میرے خلاف کیا اور کروایا' اس میں اگر ان کی بدنیتی اور بددیانتی شامل نہیں ہے تو پھر یہ بلاشبہ اس ملک کیلئے دشمنوں کی کارروائی کا شاہکار ہے۔ یہ لوگ غلط فہمیاں کس طرح اور کس نوعیت کی پیدا کرتے ہیں' اس بارے میں بھی آگے کچھ گزارش کرونگا۔ اسی سے مجھے یاد آیا کہ بھٹو مرحوم کے ساتھ میرے جو اختلافات تھے ان میں ایک دلچسپ امر یہ تھا کہ ان کے صدر بننے سے پہلے ہی ان کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ آزاد کشمیر میں میرا صدارتی انتخاب (اکتوبر ۱۹۷۰ء) درحقیقت جماعت اسلامی پاکستان نے لڑا تھا اور اس طرح میں حکومت میں اس جماعت کی نمائندگی کرتا تھا۔ بلکہ انہی ایام میں مولانا کوثر نیازی نے اپنے ہفت روزہ "شہاب" کے ایک خصوصی شمارے کو صرف یہ بات ثابت کرنے کیلئے وقف کر دیا تھا کہ "سردار عبدالقیوم نہ صرف جماعت اسلامی کی وجہ سے صدر بنا ہے بلکہ وہ دراصل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا جانشین بننے والا ہے"۔

مجھے چونکہ اس بات کی حقیقت کا علم تھا۔ اس لئے بھٹو صاحب کے ساتھ ان کے صدر بننے کے کافی دیر بعد اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ پہلے تو اور بات تھی' مگر اب آپ ملک کے صدر ہیں۔ آپ کی اطلاعات اب تو زیادہ درست ہونی چاہئیں۔ پھر میں نے اچھرہ میں جماعت کے مرکزی دفتر میں مولانا (مرحوم) کے ساتھ اپنی اس ملاقات کا بھی ذکر کیا جس میں راقم الحروف نے انتخابات میں ان سے مدد کیلئے کہا تھا اور اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا تھا وہ بھی بتایا جو بذات خود ہماری قومی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بلکہ شاہکار ہے۔ تاہم میں نے بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ مجھے اپنی پوزیشن کی وضاحت مطلوب نہیں ہے' نہ مجھے کوئی سند چاہئے' نہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں اگر یہ درست ہو۔ مگر ایک حکمران کو کسی بھی معاملہ میں معلومات تو درست رکھنی چاہئیں تاکہ وہ غلط فہمی میں کوئی اقدام نہ کرتا پھرے۔ میں نے موجودہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے بھی کہا تھا کہ میرے خلاف لاکھوں روپے کے غبن اور خرد برد کا الزام اس طرح لگوانے سے پہلے اگر آپ خود اطمینان کر لیتے تو کیا برا تھا؟ اس وقت جب یہ الزامات لگائے جارہے تھے' آزاد کشمیر کا سیکرٹری مالیات خود صدر صاحب کا عزیز تھا' جس کے ساتھ میری کوئی شناسائی بھی نہ تھی۔ یوں بھی کسی حکومت میں سیکرٹری مالیات ہی وہ واحد شخص ہوتا ہے جسے ہر قسم کی مالی بے قاعدگیوں' خرد برد' غبن اور جو کچھ بھی ہوا ہو' اس کا کماحقہ علم ہوتا ہے۔ بلکہ میں نے صدر صاحب سے کہا تھا کہ چلئے

Marfat.com

آپ نے ان سے دریافت کرنا اگر مناسب نہیں سمجھا تو نہ سہی، مگر انہوں نے میرے بارے میں یکطرفہ مقدمہ میں جو بیان عدالت میں دیا تھا، اس بیان کو منگوا کر دیکھ لیتے؟ لیکن جب اصل میں بات وہ ہو جو مشہور ہے کہ ......

''ایک شیر نے جو ندی کے اوپر کی طرف پانی پی رہا تھا فاصلے پر نچلی طرف ایک بکری کے بچے کو پانی پیتے دیکھ لیا تو اسے پھاڑ کھانے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرنے لگا۔ (غالباً وہ شیر مہذب قسم کا ہوگا جو ہوتا نہیں ہے) چنانچہ اس نے بکری کے بچے سے کہا کہ تم پانی گندہ کر رہے ہو۔ اس نے بڑے ادب سے کہا کہ جناب پانی تو اوپر آپ کی طرف سے نیچے کی طرف آتا ہے نہ کہ نیچے سے اوپر کی طرف، جبکہ میں اتنی دور، نیچے سے پانی پی رہا ہوں'' تو شیر نے غصہ سے جواب دیا ......

''اچھا تیری یہ جرأت کہ مجھ سے بحث کر رہے ہو اور یہ کہہ کر اس پر جھپٹ پڑا''۔

میرے ساتھ تو اس نوعیت کے واقعات متعدد بار پیش آئے۔ مگر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میں ایک ایسا واقعہ بیان کروں جو لفظی طور پر بھی ہو بہو اسی طرح کا تھا۔ ۶۹ - ۱۹۶۸ء میں بہ حیثیت صدر مسلم کانفرنس میں نے مظفر آباد کے ایک دور افتادہ اور سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ دراوہ کا دورہ کیا۔ اس قافلے میں کئی کارکن رفیق سفر تھے۔ جنگلات سے ڈھکے ہوئے فلک بوس برف پوش پہاڑوں کے دامن میں کھوئی ہوئی خاموش سی ایک چھوٹی سی بستی دودنیال ہے۔ جہاں ہم نے ایک روز قیام کیا۔ راستہ چونکہ سب پیدل تھا اور شاید ہم لوگ دوسرے یا تیسرے دن وہاں پہنچے تو ہم نے کپڑے دھونے کا پروگرام بنایا۔ وہاں پانی وافر ہے۔ ایک پہاڑی نالہ بھی ہے اور دریا بھی ساتھ ہے۔ ایک دو ساتھی آئے اور کہنے لگے کہ یہاں پر متعین نار درن سکاؤٹ ہیں۔ وہ کپڑے دھونے سے منع کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک شفاف چشمہ ہے جس کے ارد گرد کپڑے سے پردہ کیا گیا ہے۔ ہمارے لوگ چشمہ سے دور نچلی طرف اسی پانی سے کپڑے دھو رہے ہیں۔ میں نے پانی پر کھڑے ایک سکاؤٹ سے پوچھا ''کیا معاملہ ہے'' وہ برملا کہنے لگا ''دیکھو'' وہ لوگ اس چشمہ کے پانی سے کپڑے دھو رہے ہیں جبکہ ہم لوگ بھی یہاں سے ہی (جو جگہ پردے میں تھی) پانی پیتے ہیں۔ یعنی ان کے خیال میں چشمے کا پانی ناپاک ہو رہا تھا۔ ہم لوگ یہ دیکھ اور سن کر حیران رہ گئے اور غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ مگر کرتے کیا؟ اس تمام علاقہ میں فوج کے بجائے وہی سکاؤٹس ہی تھے۔ میں نے اس کو واقعی کچھ سخت سست کہا اور ہم لوگ وہاں سے چلے گئے پھر بعد میں کچھ تگ و دو کے بعد حکومت نے ہماری درخواست سن لی اور سکاؤٹس کے بجائے وہاں فوج متعین کی جس سے ان غریب لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہوئی۔ ورنہ جو لرزہ خیز اور انسانیت سوز مظالم کی داستانیں ہم وہاں سنتے تھے، وہ ناقابل بیان ہیں اور کسی بھی انسانی معاشرے کیلئے خدا کے عذاب کو دعوت

Marfat.com

دیتی ہیں۔

بہر حال میں نے جب مولانا کی تحریر دیکھی تو وہیں اسی دن جیل میں قلم اٹھایا اور مولانا کوثر نیازی کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔ مگر جوں جوں لکھتا گیا' کئی دوسرے متعلقہ امور کی خود بخود آمد کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ طوالت کے خوف سے میں نے متعدد واقعات کو پھر کسی دوسرے مرحلے کیلئے اٹھار کھا۔ ان وجوہات کی بناء پر یہ تحریر وجود میں آ گئی۔ البتہ یہ تمہیدی کلمات تو میں نے اپنی رہائی کے کافی عرصہ بعد لکھے' کیونکہ کچھ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ معاملہ محض میرا ذاتی نہیں تھا۔ اس لئے لکھتے وقت جو امور مجھے اس قابل محسوس ہوئے' میں نے ان کو لکھ دیا اور خدا کے فضل و کرم سے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک ہے نہ دریغ کہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ان کا ایک ایک گوشہ اور شوشہ کبھی بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ میں نے کسی واقعہ میں اپنی طرف سے طرز بیان کے سوا کچھ نہیں بڑھایا۔ جو دوسرے فکری امور ہیں' تو ظاہر ہے کہ وہ میری اپنی فکر ہے۔ میں کسی کو اس کا مکلف سمجھتا ہوں' نہ ذمہ دار۔ اصل تحریر میں بعض معمولی مگر ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ لیکن وہ اضافے بلاشبہ اس تاریخی تسلسل اور انسانی کردار کا حصہ ہیں۔

جب میں اس تحریر کا اصل مسوّدہ لکھنے بیٹھا تو آٹھ گھنٹے روزانہ کی ایک نشست کے حساب سے یہ مسوّدہ چار نشستوں میں مکمل ہو گیا۔ لیکن جب اس کو درست کر کے دوبارہ لکھنا شروع کیا تو اس میں تقریباً دو ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ پھر بھی اطمینان نہیں تھا۔ تاہم سہ بارہ لکھنے کی تو اب تک ہمت نہ ہوئی۔ مکمل ہونے پر اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کو مولانا تک کیسے پہنچایا جائے۔ جیل خانہ میں رہ کر ایک طریقہ تو وہی تھا جو معروف ہے کہ بلا اجازت چوری سے بھجوا دیتا۔ دوسرا سرکاری ذریعہ ہے۔ مگر سرکاری ذریعہ سے تو یقین واثق تھا کہ یہ تحریر کسی صورت بھی مولانا تک نہیں پہنچ سکتی۔ مولانا تک یہ تحریر بھیجنا تو درکنار' میں نے صدر ضیاء الحق صاحب کو خط لکھنے کیلئے امداد چاہی' تو وہ بھی نہ ملی۔ جہاں تک بلا اجازت چوری سے بھجوانے کا تعلق ہے' وہ اگرچہ بے حد آسان اور یقینی تھا۔ مگر میں طبیعت کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔ جیل میں رہ کر میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ایک اچھا قیدی ثابت ہوں اور کوئی ایسی بات نہ کروں جو کسی اعتبار سے بھی جیل کے عملہ کیلئے پریشانی کا باعث ہو اور نہ ہی میں نے اس عملہ کی ہمدردی سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کو بھی میں ان ہمدردوں سے ایک طرح کی غداری تصوّر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے رئیس الاحرار چودھری غلام عباس (مرحوم) کی یہ بات بھی یاد آئی کہ وہ سگریٹ نوشی کے سخت عادی تھے' حتیٰ کہ ڈاکٹروں کے منع کرنے کو بھی خاطر میں نہ لاتے' مگر جب کبھی قید ہوتے تو سگریٹ نوشی ترک کر دیتے' صرف اس لئے کہ وہ جیل میں رہ کر کوئی ناجائز یا غیر ضروری رعایت حاصل کرنے کے خلاف تھے۔ ان کے کردار کی عظمت کا اس سے بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ تو قید کے دوران بیوی بچوں سے بھی ملاقات نہ کرتے تھے۔

Marfat.com

اس وجہ سے یہ مسوّدہ میری رہائی تک جو چھ ماہ بعد ہوئی ' میرے پاس ہی پڑا رہا۔ باہر آ کر بھی بعض مصروفیات حائل رہیں۔ اس طرح اسے مولانا کے پاس بھجوانے میں کافی تاخیر ہوئی۔

اصل خط میں بعض مقامات وضاحت کئے بغیر سمجھنا مشکل تھے۔ مجھے خود بھی ان کو سمجھنے میں کافی دقّت ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کو شائع کرنے سے پہلے میں نے کچھ اضافے کر کے ان مقامات کی ضروری وضاحت کر دی ہے۔ اس مضمون کا کچھ حصہ جنگ میں مولانا کے کالم "مشاہدات و تاثرات" میں چھپ چکا ہے۔ پورا مضمون بوجوہ شائع نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن جن حضرات کے نظر سے مضمون کا اتنا حصہ غالباً چار قسطیں گزرا تھا' ان کا پیہم اصرار تھا کہ وہ پورا مضمون شائع کر دیا جائے۔

نہ صرف مجھے بلکہ مولانا کو بھی اس مضمون کے بارے میں بے شمار خطوط اور پیغامات ملے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو خالی چیک پر دستخط کر کے میرے لئے مولانا کو بھجوا دیا تھا۔ مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔ ایک تو اس لئے کہ ان صاحب سے رابطہ نہ ہو سکا۔ دوسرے اس لئے کہ وہ غالباً قادیانی تھے۔ تیسرے اس لئے کہ میں اپنے خیال کی وسعت کو کسی دوسرے پر کیسے آزماتا اور چوتھے اس لئے کہ کوئی کام مخصوص و متعین نہیں ہو سکا جس کے لئے میں وہ رقم استعمال کرتا اور پانچویں اس لئے کہ بھیجنے والے کی نیت کے بارے میں قیامت کو کیسے وضاحت کرتا کہ اس کا مقصد کیا تھا اور میں نے وہ رقم کیسے استعمال کی؟

اسی طرح اہل تصوّف نے بھی بعض مسائل کے بارے میں مجھ سے رجوع کیا۔ سیاسی کارکنوں کیلئے تو اس میں کئی درس ہیں۔ اہل اخلاق و کردار کیلئے بھی ایک ادنیٰ سا نمونہ اس میں موجود ہے۔ بہرحال زندگی کے کئی شعبوں سے تعلق رکھنے والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور بہ اصرار تقاضا کیا کہ میں اس مکمل مضمون کو شائع کر دوں۔ چنانچہ وہ اب مکمل کر لیا گیا ہے۔ اتنا وقت اس لئے لگ گیا کہ مجھے اس کو پڑھنے اور درست کرنے کا وقت نہ مل سکا۔ سفر و حضر کے دوران مصروفیات میں سے چند لمحے چھین کر اسے مکمل کر لیا۔

چونکہ اصل مسوّدہ ایک خط کی شکل میں ہے 'اس لئے اس کو اسی حالت میں رہنے دیا گیا۔

"وماتوفیقی الاباللہ"

سردار عبدالقیوم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ قَالَ عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ الخ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔

محترم و مکرم بھائی مولانا کوثر نیازی صاحب'

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

حال ہی میں روزنامہ "جنگ" میں شائع شدہ آپ کا ایک مضمون بہ عنوان "مشاہدات و تاثرات" میری نظر سے گزرا ہے جس میں میرے بارے میں صاحبزادہ فاروق علی کے ایک انٹرویو کے حوالے سے بلکہ اس کے جواب میں آپ نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

عمر بھر میری یہ کمزوری رہی ہے کہ میں اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کا اہتمام کے ساتھ جواب نہیں دیتا۔ البتہ یہ ضرور دیکھتا ہوں کہ جس کسی نے بھی کچھ کہا ہے اگر وہ نقائص فی الواقع مجھ میں ہیں تو میں ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور دل میں ان مخالف نما دوستوں کا شکر گزار بھی کہ انہوں نے میری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے مجھے آگاہ کیا۔ اسی طرح اگر وہ باتیں جھوٹی' من گھڑت یا سنی سنائی ہوں' جیسا کہ عموماً ہوتا ہے' تو اس معاملے کو خدا کے ہی سپرد کر دیتا ہوں کہ وہی احکم الحاکمین اور مقلب القلوب ہے۔ دلوں کا پھیرنے والا ہے اور اسی کے سامنے جواب دہی ہے' یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ مالک الملک نے ہمیشہ میری براءت کی اور الزام لگانے والوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔ بہرحال جس کا ضمیر زندہ ہو اس کو تو ضرور احساس ہوتا ہے مگر جن کے ضمیر پر مہریں لگی ہوں وہ تو پھر رخصت پر ہیں۔ مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر خدانہ کرے میں خدا کے سامنے جھوٹا ہوں تو لوگوں میں پھر براءت ہو بھی تو کیا اور کب تک۔ یوم حساب تو بہرحال سر پر ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ بلکہ وہ تو ایک آزمائشی مرحلہ ہوتا ہے جس نے آنے کی طرح ہی جانا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے بھی میں نے کبھی ان باتوں

Marfat.com

کا ترکی بہ ترکی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، حتیٰ کہ میرے اس عمل نے کچھ لوگوں کو ایسا دیدہ دلیر بنا دیا ہے کہ وہ آئے دن میرے بارے میں من گھڑت افسانے تراشتے رہتے ہیں ــــــــــــــ اور بہتان تراشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن "اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" (میں صرف اللہ سے ہی اپنے غم و حزن کا شکوہ کرتا ہوں)

پھر آپ نے جن جامع الفاظ میں تردید یا وضاحت کر دی ہے، اس کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت بھی تو باقی نہیں رہتی۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے بروقت اس کا نوٹس لیا ورنہ میں نے کب صاحبزادے کا انٹرویو پڑھنا تھا۔ میرے بارے میں اظہار رائے کے حق کے علاوہ آپ کی اپنی دیانتدارانہ معلومات کا تقاضا بھی یہی تھا۔

تاہم مولانا! اس مذکورہ انٹرویو میں دیئے گئے ریمارکس کا دائرہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ ان چند جملوں کے پس پردہ ایک پورا تاریخی عمل ہے۔ کسی براءت یا عدم براءت کے خیال کے بغیر بھی محض اسی غرض سے کہ ریکارڈ درست کیا جائے اور کچھ سادہ لوح حضرات کو اس سوچی سمجھی اور بامقصد سکیم کی گمراہی سے باخبر کیا جائے ضروری ہے کہ میں اس بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ اپنی معلومات گوش گزار کروں۔

مذاکرات سے مارشل لاء تک

یوں بھی میرے کئی دوست واحباب کا مسلسل تقاضا رہا کہ میں "مذاکرات سے مارشل لاء تک" کی روئیداد قلم بند کروں۔ مگر انہیں فرصت ملی نہ مجھے۔ باہر ہوتا ہوں تو عوام کے ساتھ وقت گزرتا ہے اور اگر کبھی قید ہونا پڑے تو وہاں کچھ علمی، فکری اور قلبی استفادہ کرنے کا شوق غالب رہتا ہے۔ اس طرح ماضی بس ایک خواب بن کر رہ گیا ہے اس کو یاد کرنے یا زندہ رکھنے کا موقع ہی میسر نہ آیا۔ پھر ایک اتفاق یہ بھی ہے کہ زندگی کے اس سفر میں نہ صرف یہ کہ قیام کا ہی کوئی وقت نہ آیا بلکہ نت نئے واقعات اپنا تقاضا کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اس سفر کا آغاز کسی ایسی ساعت میں کیا کہ ختم ہونا تو درکنار، چند لمحے رکنے کا نام بھی نہیں لیتا۔ ہماری حالت حضرت حافظ کے اس شعر کی طرح لگتی ہے۔

؂ رنجِ مارا نیست پایاں الغیاث
دردِ مارا نیست درماں الغیاث

عجیب اتفاق ہے کہ کئی سال پیشتر ہم حافظؒ کے دیوان سے فال نکالا کرتے تھے۔ میں نے جب بھی فال نکالی ہر بار یہی شعر نکلتا رہا۔

Marfat.com

گدر کھیڈ

"مذاکرات سے مارشل لاء تک" کچھ لکھنے میں ایک بنیادی مانع یہ بھی ہو گیا کہ مذاکرات کا جو انجام ہوا اس نے بالکل کایا پلٹ دی۔ بعد کے حالات کے باعث وہ تاریخی رابطہ ہی ٹوٹ گیا۔ ایسے میں کون کس کو کیا سناتا کہ ہم نے یہ سفر کیسے اور کیوں کیا تھا۔ اس سے کس کو دلچسپی رہ گئی تھی۔ ہمارے ہاں ایک پہاڑی محاورہ ہے (جس کا بدل اردو میں مجھے معلوم نہیں) "گدر کھیڈ"۔ "کھیڈ" تو پنجابی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "کھیل" اور "گدر" مخفف ہے۔ گدرے کا۔ گدرا کہتے ہیں کسی بے لگام اور لا ابالی طبیعت والے لڑکے کو۔ بے ادب 'گستاخ' نالائق وغیرہ ہمہ صفت موصوف اور پھر نوجوان بھی۔ مراد اس محاورے سے یہ ہے کہ کچھ سنجیدہ لوگ ایک خاص قرینے سے کوئی کھیل کھیل رہے ہوں یا کوئی کام کر رہے ہوں تو چند بے ہنگم "گدرے" جبراً وہاں داخل ہو جائیں اور اس کام پر قبضہ کر لیں جبکہ ان کو اس کھیل یا کام کا کوئی علم نہ ہو۔ پھر وہ دھما چوکڑی مچائیں کہ نہ کھیل کا میدان درست رہے نہ کھیلنے کے آلات 'نہ کوئی قاعدہ یا ضابطہ۔ اسلئے اس کو "گدر کھیڈ" کہتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی کھیل کے طریقے یا قاعدے کی دہائی دے یا ان معرکتہ الآراء ٹیموں کا ذکر کرے جو پہلے وہاں کھیل چکی ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ سب ان کا منہ چڑائیں گے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک دیوانے شخص کی بات یاد آ گئی جو سردیوں کے موسم میں میرے ساتھ والے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ چارپائی پر لحاف اوڑھ کر پوری رات بیٹھا رہا اور اونچی آواز سے پڑھتا رہا "نہ غلط نہ صحیح۔ نہ غلط نہ صحیح" ایسے حالات میں کون ماضی پر وقت ضائع کرتا۔

اظہار حقیقت کا عزم

بہرحال اس کام کے لئے خود کو مشکل سے آمادہ کیا لیکن پھر خیالات کا ایک طوفان امڈ آیا جس کو روکنا میرے بس میں نہ رہا۔ جتنا ممکن تھا اختصار کرتا گیا۔ پھر بھی یہ خط نہیں ایک قسم کا تحقیقی مقالہ (Thesis) ہو گیا۔ لیکن آپ اس میں نہ کوئی ادبیت تلاش کریں نہ ادیبانہ بندشیں اور ترکیبیں۔ جو بات جہاں میرے خیال میں آئی 'میں نے بیان کرنے میں کوئی بخل نہیں کیا۔ کئی باتیں اگرچہ ضمنی طور پر ہی کہی گئی ہیں مگر وہ موضوع کے ساتھ براہ راست تعلق بھی رکھتی ہیں اور ان کے بغیر شاید پوری بات سمجھ میں نہ آ سکتی۔

الزامات اور صاحبزادہ کی اہلیت

ابھی تو مجھے یہ سمجھنا بھی باقی ہے کہ فاروق علی خان کے اس انٹرویو کا محل کیا تھا۔ اس کی اس وقت قوم کو کیا خاص ضرورت پڑ گئی تھی۔ پھر یہ سوالات خاص کر پی این اے کے بارے میں ہی کیوں؟۔

Marfat.com

دوسرے ان سوالات سے ہی ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہی جوابات تھے۔ یہ ڈراما اس وقت کیوں رچایا گیا؟۔ صاحبزادے کی حیثیت اس دور حکومت میں ایسی کون سی تھی کہ وہ اندرونی رازوں سے واقف تھے جن کو وہ اپنے سینے میں آج تک چھپائے رہے، کس کو معلوم نہیں کہ اس دور کا سپیکر کیا تھا اور اسکی حیثیت کیا تھی، بہرحال صاحبزادہ صاحب نے چونکہ ایک پورا موضوع چھیڑ دیا ہے، اسلئے اس سے صرف نظر بھی نہیں ہو سکتا۔ قومی اتحاد کے ایک قائد تو فوت ہو گئے ہیں، اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ باقی حضرات نے اگر مناسب سمجھا تو وہ اسکی مزید وضاحت خود کر دیں گے۔ کیونکہ پی این اے میں اگر واقعی ایسے ہی رہنما تھے تو یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا سانحہ اور ایک لاینحل مسئلہ بھی ہے کہ ایک حکومت کے ایجنٹوں نے خود ہی اس حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ صاحبزادے نے 'اگر ان کی نیت بخیریت ہے، محض تخمین وظن سے کام لیا ہے تو ان کو برملا اس سے رجوع کرنا چاہئے اور معافی مانگنی چاہئے۔ اگر ان کے پاس کوئی براہ راست معلومات ہیں تو ان کو پوری طرح ظاہر کر دینا چاہئے تاکہ عوام کو ایسے لوگوں کی صحیح خبر ہو جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس وقت تک تو بہرحال وہی قائدین ہیں۔ مجھ سے ہو سکتا تو میں فاروق علی خان کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کرتا۔

سیاستدانوں کی کردار کشی

میرے علم کی حد تک قومی اتحاد کے قائدین حکومت کے مخالف تو تھے مگر ان میں حکومت کا ایجنٹ کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے بارے میں تو بہرحال بلا خوف تردید برملا کہہ سکتا ہوں کہ حکومت کا ایجنٹ ہونا تو درکنار، میرا کوئی خصوصی رابطہ تک نہیں تھا۔ وہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرا مزاج اور میری طبیعت بھی وہ نہیں ہے۔ پھر جب خود بھٹو صاحب جو یہ کہتے تھے کہ ان لوگوں کو امریکہ روپیہ دے رہا ہے تو اس کی کیا توجیہہ ہو گی۔ اسی طرح کچھ لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ فوجیوں کے ایجنٹ ہیں۔ اگر حکومت کے ایجنٹ تھے یہ لوگ، تو پھر اکیلے باجوہ پر ہی شک کی بناء پر کیوں قیامت توڑی گئی تھی۔ یہ عجیب وغریب منطق ہے جو آسانی سے تو سمجھ میں نہیں آسکتی۔ سیاستدانوں کی کردار کشی کس دور میں نہیں ہوئی۔ مگر یہ نیا طریقہ ہے۔ دیکھئے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

کچھ اپنے بارے میں

مسٹر فاروق علی کی اس بات سے اصل میں دوسری باتوں کے علاوہ خود ہماری سیاست، سیاستدانوں کے کردار اور ہماری سیاسی اساس کے بارے میں ہی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ میں یہ طویل مقالہ نما خط لکھ رہا ہوں۔ صاحبزادے کی بات کے علاوہ مجھے کچھ اور سوالات وشبہات کا ذکر بھی

Marfat.com

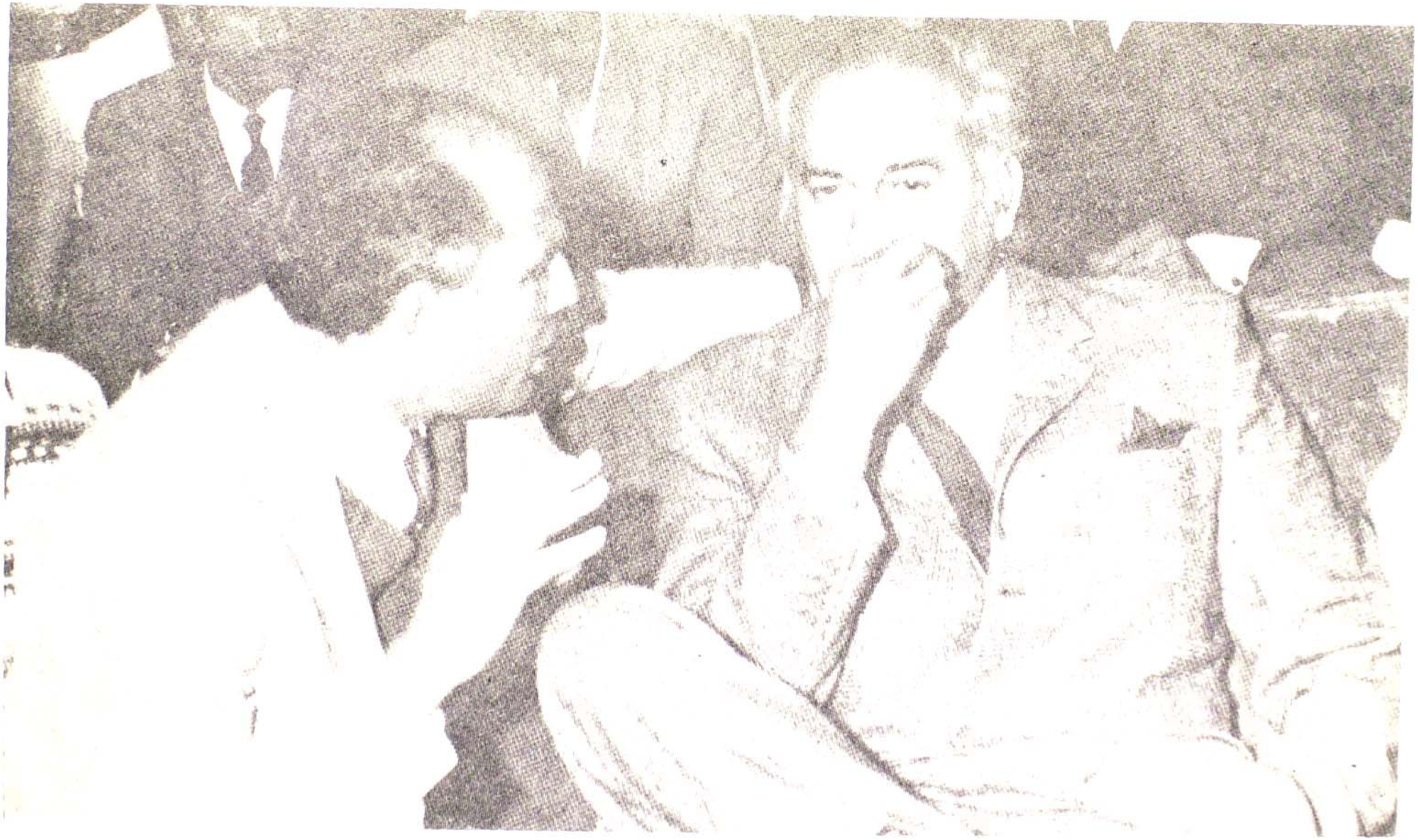

ذوالفقار علی بھٹو اور صاحبزادہ فاروق علی خان

Marfat.com

کرنا ہے۔ اسلئے کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، بعض ایسی باتیں ہوتی رہی ہیں جو سیاست کے مروّجہ طریق کار کے نہ صرف مطابق نہیں ہیں بلکہ بسا اوقات اس کے عین برعکس بھی ہیں۔ ان باتوں سے بھی کئی حضرات خواہ وہ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں، اولاً تو معمول کے مطابق غلط اندازہ ہی لگا سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم شک اور تردّد میں تو ضرور ہی پڑ سکتے ہیں، خاص کر جبکہ میری جانب سے کوئی توضیح یا توجیہہ نہ ہو رہی ہو۔ تو اس طرح یہ ایک قسم کا مجھ پر قومی قرض ہے جسے جلد یا بدیر مجھے ادا کرنا ہی ہے تو کیا حرج ہے۔ اپنے بارے میں کچھ کہنے میں ہمیشہ میری طبعی رکاوٹ حائل رہی ہے۔ اس کا اثر میرے قریبی دوستوں پر بھی ہے۔ ورنہ ہرایرے غیرے کے بارے میں آئے دن کیا کچھ نہیں لکھا جاتا۔ کتابیں مرتب ہوتی ہیں اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔ مگر میں نے اس سے گریز ہی کیا، ورنہ یقیناً میری زندگی میں ایسی کئی باتیں ہوئی ہیں کہ ان پر کئی نسلیں بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں لیکن میں زیادہ تر حال اور مستقبل کے حالات سے ہی نبرد آزما رہا اور ماضی کو بس اسی کے حال پر چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس پر مجھے استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

میں اس وقت گذشتہ ۳۵ سال پر تسلسل کے ساتھ پھیلے ہوئے بے شمار واقعات سے پر ماضی کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ صرف اسی دور کی بات کروں گا جس کا ذکر چھیڑا گیا ہے۔ اس دور کا صرف مسٹر فاروق علی ہی ایک گواہ نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ معتبر اور متعلق لوگ ہیں جو ابھی بفضلہ زندہ بھی ہیں اور کسی ترجمان کے محتاج بھی نہیں۔ یقیناً ان بڑے گواہوں میں سے ایک آپ (مولانا کوثر نیازی) بھی ہیں جنہیں اکثر و بیشتر واقعات کا براہ راست علم ہے۔ پھر موجودہ حکومت سے تو کوئی راز جو سرکاری تھا وہ اب مخفی نہیں ہے اور یہ حکومت جس قدر مجھ پر مہربان ہے وہ بھی کوئی زیادہ گہرا راز نہیں ہے۔

انداز تنقید اور اس کا ردّ

ہر کسی کے بارے میں اچھا یا برا گمان رکھنے والے بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات کے خیالات کا دارومدار تو محض خبر پر ہوتا ہے۔ خبر کی تحقیقات نہ تو سب کر ہی سکتے ہیں نہ ہی یہ ممکن ہے۔ اس لئے اس کی تاویل ہی زیادہ سے زیادہ احسن طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ بے شمار لوگوں کے دل میں فاروق علی کی بات نے شک ڈالا ہو گا۔ لیکن آپ کی بات سے بڑی حد تک اس کا ازالہ بھی ہو گیا ہو گا اور اگر میری طرف سے صرف اتنا ہی کہہ دیا جائے کہ یہ سب غلط ہے تو کئی لوگوں کیلئے صرف وہی کافی ہے۔ لیکن ایک گروہ تو بہر حال ایسا رہے گا جو کسی وضاحت کو بھی قبول نہیں کرے گا۔ اگر ان کو سو فیصد یقین بھی ہو کہ وہ الزام غلط تھا، تب بھی ان کے دل اسی کو صحیح تسلیم کریں گے۔ مگر میرے خیال میں اس نوعیت کے الزامات کا صحیح یا غلط ہونا اتنا معتبر نہیں ہے جتنا کہ وہ اصول اور فلسفہ جاننا ضروری ہے جو ہماری پوری زندگی پر

Marfat.com

اس وقت محیط ہے جس کے معیار پر ایسے امور کو پرکھا اور جانچا جانا چاہئے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ دوست واحباب محض حسن ظن سے ہی کام نہ لیتے رہیں بلکہ ان کو اس معاملہ کے صحیح میرٹ (حسن و قبح) کا بھی علم و یقین ہو جائے۔

شرط وفاداری

اپنے بارے میں صفائی پیش نہ کرنے کی میری یہ عادت کئی بار بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی رہی۔ ہمارے قائد جناب چودھری غلام عباس خان مرحوم کے اور میرے درمیان کئی بار شکر رنجی تک محض اسلئے نوبت پہنچی کہ ان کو ایسی اطلاع ملی جس سے میرے بارے میں کچھ شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ مگر میں نے اس کی کوئی تردید، تائید یا وضاحت نہ کی۔ محض اس لئے کہ جب بنیادی امور میں اعتماد ہو تو جزوی معاملات میں زیادہ چھان بین کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ پر اس خیال کے غلبہ کی ایک اور مثال اس سے زیادہ واضح ہوگی کہ میں ۵۳/۱۹۵۲ء میں راولپنڈی جیل میں قید تھا تو چند دنوں بعد ہمارے کشمیر کے سی آئی ڈی کے انچارج پولیس آفیسر سید عباس علی شاہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کہتے ہیں کہ "وہ اگر یہ لکھ دے کہ "میں پاکستان کا وفادار ہوں" تو اسے رہا کر دیا جائے گا"۔ مجھے یہ بات بے حد ناگوار گزری۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا "خواجہ صاحب سے کہو کہ اگر وہ چاہیں کہ میں صرف اتنا لکھ دوں کہ "میں مسلمان ہوں" تب بھی میں ایسا نہیں لکھوں گا۔ جب تک میں یہاں ہوں۔ اگر میں پاکستان کا وفادار ہوں تو صرف اس لئے کہ وہ میرا ملک ہے۔ اس کا نہ کسی پر احسان ہے نہ لالچ اور نہ کسی سے کسی سند کی ضرورت اور اگر خدانخواستہ میں وفادار نہیں ہوں تو میں منافقت نہیں کرنا چاہتا۔ نہ مجھے رہائی کا اتنا شوق ہے"۔

اس معاملہ کا تعلق محض کسی حادثے یا اتفاق سے نہیں ہے۔ یہ بات کردار سے تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر میری سیاسی فکر کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔ انسان کا کردار بھی زیادہ تر اس کی بنیادی سوچ و فکر پر ہی تعمیر ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کی اقدار کے بارے میں جو بھی کسی کے بنیادی خیالات ہوں گے اس کا کردار زیادہ تر ان ہی کا آئینہ دار ہو گا۔ اس لئے بھٹو صاحب کے دور حکومت سے پہلے کے بھی کچھ واقعات و معاملات پر اجمالاً کچھ کہنا پڑے گا۔ اس میں شک نہیں کہ کردار کی تبدیلی بسا اوقات حادثۃً بھی ہو جاتی ہے مگر اس میں بھی وہی اصل بنیادی خدوخال قائم رہتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص شرابی تھا تو پھر زاہد ہو گیا۔ تو ایسا بہت ہوتا ہے اور اس کے برعکس بھی۔ لیکن اس کا شراب پینا محض ایک عارضی فعل تھا اس کی اصل درست تھی۔ اسی طرح دوسرے کا زہد محض کوئی رد عمل ہو گا اصل نہ ہو گا۔ چنانچہ کچھ باتیں زندگی بھر میرے ساتھ رہی ہیں وہ کسی حادثے یا مصلحت کی پیداوار نہیں ہیں۔

Marfat.com

سہالہ جیل سے رہائی اور شکوک

کچھ اعتراضات اور شکوک کیسے پیدا ہوتے ہیں، یہ بات اس مثال سے شاید زیادہ بہتر سمجھ میں آئے۔ جب میں سہالہ سے رہا ہو کر اچانک کراچی پہنچا تو میرے ایک عزیز بھائی میجر محمد نسیم خان صاحب بھی وہیں تھے اور مجھے ان کے ساتھ ہی ٹھہرنا تھا۔ وہ مجھے اچانک دیکھ کر پریشان ہو گئے اور ضبط نہ کر سکے۔ کہنے لگے "آپ اکیلے کیسے رہا ہو گئے ہیں"۔ میں ان کی بات تو سمجھ گیا مگر کوئی بھی جواب اس وقت ان کی صحیح تشفی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا "ایک دو دن میں بتاؤں گا کہ کیا بات ہے"۔ ان کی بے چینی بالکل صحیح تھی اور یہی کسی بھی باحمیّت شخص کا صحیح ردّ عمل ہونا چاہئے تھا۔ بہر حال وہ تو بات پھر ان پر واضح ہو گئی۔ عین ممکن ہے کہ کئی دوستوں کے نزدیک میری وہ رہائی ابھی تک ایک معمہ بنی ہو۔

اسی طرح ہمارے قابل احترام بھائی محمد حسین چٹھہ صاحب نے میری عدم موجودگی میں بھی دوستوں سے استفسار کیا اور ایک مرتبہ میاں ممتاز دولتانہ صاحب کے گھر پر ان کی موجودگی میں مجھ سے بھی پوچھا "سردار صاحب! جب بھی آپ کے دورے کی خبر آتی ہے تو میں کاغذ پنسل لیکر بیٹھ جاتا ہوں اور حساب لگاتا رہتا ہوں۔ آپ اس کا انتظام کیسے کرتے ہیں؟"۔ میاں صاحب کو لامحالہ خیال ہو گا کہ اس سوال سے شاید میں ایسا مطلب لوں جو معروف ہے۔ اسلئے انہوں نے بات ٹال دی اور مجھے بھی چٹھہ صاحب کے ساتھ بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ مجھے یقین ہے کہ چٹھہ صاحب کسی شک وشبہ کا اظہار نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ نیک نیتی سے جاننا چاہتے ہوں گے کہ مادی طور پر ایسا کس طرح ہوتا ہے۔ کیونکہ غالباً ان کی اپنی نقل و حرکت کے راستے میں بھی رکاوٹ ہو گی۔ اسی طرح کئی دوستوں کو سہالہ میں میری آمد اور مذاکرات میں شمولیت کا سبب شاید پوری طرح سمجھ میں نہ آیا تھا۔

ایک ذہنی الجھن کا حل

سہالہ کے ساتھ جو چند ناقابل فراموش یادیں وابستہ ہیں وہاں ایک انہونی بات بھی یاد آ گئی۔ سہالہ سے جب میں رہا ہو کر دوسرے قائدین سے ملاقات کیلئے نکلا تو باہر سے ایک زعیم ملت نے قومی اتحاد کے ایک مرکزی رہنما کو خط لکھا جس کا مفہوم بہت نرم الفاظ میں یوں تھا "کیا کوئی پاکستانی اس قابل نہیں تھا کہ اس کشمیری کو اس کام پر لگایا ہے"۔ مجھے اس سے کچھ ذہنی کوفت بھی ہوئی مگر اس لحاظ سے بہت اچھا بھی ہوا کہ اس سے میری اپنی ایک ذہنی مشکل بھی حل ہو گئی۔ عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ جبکہ اس ملک میں تحریک پاکستان کے فلاں فلاں لوگ ابھی موجود ہیں تو ملک کے حالات ایسے کیوں ہیں اور پھر باوجودیکہ یہی لوگ تو روز اول سے موجود تنہا اور بلاشرکت غیرے اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ مگر ہم جہاں

Marfat.com

خواجہ ناظم الدین مرحوم (سابق وزیر اعظم پاکستان)

Marfat.com

ہیں وہاں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟۔ اس پیام سے وہ بات بھی سمجھ میں آ گئی۔ دراصل ان حضرات کی اصل یہی تھی۔ ان میں کئی توشیر قالین تھے اور جب اپنے اصل پر آئے تو ٹائیں ٹائیں فش ہو گئی۔

ضمناً' وہ زعیم ملت یہ الفاظ لکھتے وقت اس امر کو بھول گئے کہ وہ تحریک پاکستان اور یہ ملک خداداد پاکستان 'جن کی بدولت ان لوگوں کو نہ صرف عزت و شہرت ہی نصیب ہوئی بلکہ آزادی ایسی نعمت میسر آئی اور اس سے بڑھ کر ان کو اسلام پر قائم رہنے کی سعادت ملی 'اس سرزمین پاکستان کے آخری دفاعی حصار آزاد کشمیر کی حفاظت بھی یہی لوگ تو کر رہے ہیں جو بخیال اس زعیم کے نالائق اور ناکارہ کشمیری ہیں۔ اس مقدس تحریک' تحریک پاکستان کو بھی انہی کشمیریوں نے آج تک زندہ رکھا ہے۔ ورنہ خدانخواستہ اگر یہ کشمیری ہمت ہار جاتے یا ایسے مہربانوں کی کرم نوازی سے متاثر ہی ہو جاتے تو اس میں کیا شک ہے کہ ایسے ایک نہیں درجنوں زعیم ملت جودھپوری جوتا 'پگڑی' پائجامہ اور اچکن پہن ماتھے پر تلک لگا کر کسی اندرا رانی یا مانیکا دیوی کے چرنوں میں ہاتھ جوڑ کر نمسکار پکارنے اور کورنش بجالانے پر فخر محسوس کرتے بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ قدم اور آگے جانے میں بھی دریغ نہ کرتے جس طرح ذاکر حسین صاحب اور ان جیسے کئی زعما نے وہاں کیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اسلئے اگر کسی کشمیری میں یہ جذبہ اور صلاحیت ہو تو اسی کا زیادہ حق ہے کہ وہ اس ملک کی سلامتی 'بقاء اور استحکام کیلئے اپنی ممکنہ کوششیں بروئے کار لائے۔

ایم آر ڈی سے علیحدگی 'شکوک و شبہات

بہرحال عین اسی طرح کئی قریبی دوستوں کو شک ہے کہ میں جو ایم آر ڈی سے باہر آیا تو اس میں بھی شاید حکومت کا ہاتھ تھا اور میں نے حکومت کے ساتھ کوئی سودے بازی کی۔ گذشتہ دنوں میرے بھائی سردار شیرباز خان مزاری نے بقول اخبارات کے یہاں تک کہہ دیا "سردار قیوم کو تو ایم آر ڈی میں بھیجا ہی حکومت نے تھا" (تاہم کچھ عرصہ بعد جب میں کراچی میں ان سے ملا اور ان کو اس بیان کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے اس بیان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا) لیکن اب جبکہ اسی حکومت نے مجھے اور دوسرے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو قید کر ڈالا تو وہ بات بھی شک میں پڑ گئی اسی طرح مذاکرات کے دوران خود مذاکراتی ٹیم کے بارے میں ہی بعض دوستوں نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ یہ لوگ حکومت کے آدمی ہیں۔ بلکہ قومی اتحاد کے ایک بڑے معتبر رکن کے ساتھ چودھری ارشد صاحب کے گھر ایک میٹنگ کے دوران اس بارے میں میری خاصی تلخی بھی ہو گئی تھی جو سب مرکزی قائدین کو معلوم ہے۔ اسی طرح سہالہ میں مفتی صاحب مرحوم 'نوابزادہ صاحب اور میں ہی کیوں پہلے مرحلے پر اکٹھے ہوئے اگر ان امور کی وضاحت نہ کی جائے تو آئے دن ایسے معاملات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

Marfat.com

جن کی جو شخص جو تاویل کرنا چاہے آسانی سے کر سکتا ہے' بدنیتی سے بھی اور نیک نیتی سے بھی پھر خاص کر ایسے ماحول میں جو شکوک وشبہات اور بدگمانیوں سے لبریز ہو' بہت کم لوگ ہوں گے جو کسی بات کو سن کر کچھ تحمل اور تامل سے کام لیں ورنہ اکثر تو اسی وقت غلط تاویلات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس کی اتنی کثرت ہے کہ گویا یہ ہماری فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔

ذاتی اور قومی کردار میں تفریق

فطرت انسانی میں یہ تو ممکن ہے کہ ایک شخص ایک معاملہ میں لائق ہو تو دوسرے میں نہ ہو۔ ایک میں بلا کا ذہین ہو مگر دوسرے میں کچھ نہ جانتا ہو وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کوئی شخص ایک معاملہ میں سچ بولے اور دوسرے میں جھوٹ۔ اگر عملاً ایسا ہو تو وہ محض اتفاق ہے' اس شخص کے کردار کی عکاسی نہیں کرے گا کیونکہ دیانت اور بددیانتی' جھوٹ اور سچ مستقل عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محض حادثے سے سرزد نہیں ہوتے۔ جو اپنی آزاد مرضی سے جھوٹ بولتا ہے اس کو سچا سمجھنا حماقت ہے۔ یہ جو بعض لوگ گھر پر ہوتے ہیں اور اپنے بچوں یا نوکر کو کہہ دیتے ہیں کہ پوچھنے والے کو بتاؤ کہ وہ گھر پر نہیں ہیں' تو یہ ان کے مزاج پر جھوٹ کے غلبہ کی وجہ سے ہوتا ہے بلکہ اس کا ایک سنگین نقص یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماحول کو بھی جھوٹا اور منافق بناتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں تو ذاتی اور قومی کردار میں ایسی بنیادی تفریق نہیں ہو سکتی' البتہ کچھ دوسرے لوگوں نے اس معاملہ کی مشکلات کے باعث قومی و ذاتی کردار میں کچھ علیحدہ علیحدہ حدود و قیود مقرر کی ہوئی ہیں۔ چرچل کا مشہور قول ہے۔ اس نے کہا ہے "میں اپنی ذاتی حیثیت میں تو جھوٹ بول لیتا تھا مگر بحیثیت وزیر اعظم میں نے جھوٹ نہیں بولا"۔

بھٹو مرحوم کے ساتھ میرے اختلافات کی ایک طویل داستان ہے۔ مگر اب وہ ہم میں موجود نہیں ہیں' نہ ان باتوں کا یہ کوئی موقع ہے کہ ان کو بیان کیا جائے۔ لیکن وہ اختلافات اس طرح بھی نہیں ہیں کہ جس طرح ان کے بعد کئی لوگ ہر بری بات کو ان کے سر تھوپ کر اپنی بے ضمیری کا اظہار کرتے ہیں اور انتقام کے جذبہ کی تسکین چاہتے ہیں یا وہ نئے مالکوں کو خوش کرتے ہیں جیسا کہ ان کی عادت اور معمول رہا ہے۔ میرے اختلافات اصولی تھے اور اگر خدا کرتا بھٹو زندہ ہوتے تو تاوقتیکہ وہ اپنی رائے تبدیل نہ کرتے وہ اختلافات بہر صورت قائم رہتے' کیونکہ ان کے نزدیک وہ اختلافات ایک سیاسی مصلحت کی وجہ سے تھے جبکہ میرے لئے وہ عقیدے کا حصہ تھے۔ بہر حال ہر شخص کو اپنی رائے کا حق ہے۔

کون نہیں جانتا کہ حکومتوں کے ساتھ سودا بازی بنیادی طور پر دو قسم پر ہوتی ہے۔ کسی مالی و مادی منفعت کیلئے' خواہ اپنے لئے ہو یا دوسروں کیلئے اور کسی سیاسی مرتبے وغیرہ کیلئے۔ تیسری بات تو پھر قیامت میں مغفرت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ پر کشش معاملہ عہدے اور مرتبے کا ہے حکومت کے کاروبار

Marfat.com

میں شرکت کا ہے تو پہلے اسی کو دیکھتے ہیں کہ میرے کردار میں اس کا کتنا دخل ہے اور میرا طرز عمل اس سلسلے میں کیا رہا ہے۔ تفصیلات کے بغیر ہی چند نمایاں واقعات سے ہی اصل بات واضح ہو جائے گی البتہ بقول سعدی چمگادڑ کو اگر دن کو نظر نہ آتا ہو تو اس میں سورج کا کیا قصور ہے۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ نور
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

اصول کی بات

اکتوبر ۱۹۴۷ء والی پہلی حکومت کے قیام کے وقت میں کوئی گم نام شخص نہیں تھا۔ میرے لئے کچھ مشکل بھی نہیں تھا کہ میں اس حکومت میں شریک ہوتا۔ مگر کئی مؤثر دوستوں کے اصرار کے باوجود کہ میں کار حکومت میں شریک ہو جاؤں میں نے میدان جہاد میں رہنا پسند کیا۔ لیکن جنگ بندی کے بعد ۱۹۵۲ء میں جب میں وزیر بنا تو مجھے اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ میں سیز فائر لان توڑنے کا منصوبہ بنا رہا تھا جو اس وقت بغاوت جیسا جرم تھا۔ چنانچہ مجھ پر دفعات بھی بغاوت کی ہی لگائی گئی تھیں۔ اس پورے عرصہ میں وہ کون سا دوسرا وزیر ہے جس نے ایسی جسارت کی ہو۔ ورنہ میری وزارت تو دیر تک قائم رہتی۔ یہ کچھ مشکل نہیں تھا۔ اسی طرح ۱۹۵۶ء میں جب میں صدر بنا تو سہروردی مرحوم کے ساتھ ناراضگی محض اس بناء پر ہوئی کہ وہ میری کابینہ میں اپنی نوخیز جماعت کا ایک وزیر شامل کرنا چاہتے تھے جس سے میں نے انکار کر دیا تھا۔ میرے علاوہ اور لوگ بھی تو آزاد کشمیر کے صدر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جنہوں نے اصولوں کی خاطر مرکزی حکومت کی خواہش کو مسترد کیا ہو اور اقتدار کا سودا نہ کیا ہو؟ مگر یہ اصول کا معاملہ تھا۔ کیونکہ ایک تو وہ حکومت خالصتاً مسلم کانفرنس کی تھی۔ دوسرے کسی پاکستانی پارٹی کو آزاد کشمیر میں اقتدار میں شریک کرنا اصولاً غلط تھا۔ ورنہ میں کافی دیر تک صدر رہ سکتا تھا۔ اس پر بھی آخری کوشش کے طور پر سہروردی مرحوم کا عین اس وقت جب میں مستعفی ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا' ٹیلیفون آیا۔ مگر میں نے ان کے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا۔ سکندر مرزا کا فون آیا اور وہ اس میں مداخلت کرنا چاہتے تھے' ویسے بھی سہروردی مرحوم کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے مگر میں نے ان کو بھی منع کیا۔ کتنے لوگ ہیں ہماری صفوں میں جو ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں پھر ۱۹۶۶ء میں جب فیلڈ مارشل مرحوم کے ساتھ ہمارے تعلقات کچھ بہتر ہوئے تو انہوں نے بھی حکومت کی پیشکش کی بلکہ ہمارے قائد رئیس الاحرار چودھری غلام عباس صاحب مرحوم محض اسی مقصد کیلئے خود دھیر کوٹ تشریف لائے تاکہ مجھے منایا جائے۔ انہوں نے مجھ سے بھی بات کرنے سے قبل مقامی کارکنوں کا ایک اجلاس بلایا تاکہ وہ سب مل کر مجھے اس پر آمادہ کریں۔ مگر میں نے نامزدگی کے اصول کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نامزدگی بذات خود ایک غلط اصول ہے مگر اس سے بڑھ کر اس کے

Marfat.com

لوازمات ایسے ہیں جن کو میں کسی صورت قبول کر سکتا تھا، نہ ان کو پورا کر سکتا تھا۔ آج بھی میرا خیال اور احساس یہ ہے کہ اگر سابق حکومت (مارشل لاء کی حکومت) کے ساتھ میں بھی آنکھیں بند کر کے تعاون کر سکتا، جس کو میں یکطرفہ اور "غیر مردانہ" تعاون کہتا ہوں تو شاید جیل خانے کے بجائے آزاد کشمیر کی صدارت کوئی زیادہ دور نہ ہوتی بلکہ صدارت زیادہ قریب تھی۔ اور اگر میں سننے اور سمجھنے میں غلطی نہ کرتا تو مجھے جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی ایک بات سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا، واللہ اعلم۔

بھٹو دور حکومت کے ساتھ اختلافات اور ان کا نتیجہ

اب درمیان میں بھٹو صاحب کا دور حکومت ہے اور وہی اصل میں زیر بحث ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ ہمارے درمیان اختلافات چونکہ ان کی طرف سے تو ایک مصلحت یا حکمت عملی کا تقاضا تھے اس لئے ان سب پر یا اکثر و بیشتر پر افہام و تفہیم اور مصالحت ہو سکتی تھی وہ تو کچھ نہ کچھ ہوتی بھی رہی اور ہم مل کر کام بھی تو آخر کرتے ہی رہے البتہ کچھ اختلافات ایسے بھی تھے جو بعض لوگوں نے محض اپنے فائدے کیلئے بڑی چالاکی سے سوچ سمجھ کر پیدا کئے تھے کیونکہ اس کے بغیر بھٹو صاحب کے نزدیک ان حضرات کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی یہ المیہ صرف اسی دور کا نہیں ہے بلکہ ہماری سیاسی زندگی کا ایک بدترین شاہکار اور ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتا ہے ان لوگوں نے ایک مرحلہ پر بھٹو صاحب سے اس امر کا وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھ سے ملاقات نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح ان کی سازشوں کا راز فاش ہو جاتا تھا۔ ان کی ایک سوچی سمجھی تجویز یہ بھی تھی جو بہت کارگر ثابت ہوئی کہ ان کے بعض کارکن مجھے نام لے کر برسرعام گالیاں دیں۔ کیونکہ اس کا طبعی ردّعمل یہی ہو سکتا تھا کہ میرے ہمدرد اس کے جواب میں خود بھٹو صاحب کو برا بھلا کہیں اور وہ بات پورے اہتمام کے ساتھ وزیراعظم تک بلاناغہ بلکہ کچھ اور بڑھا چڑھا کر پہنچائی جاتی رہی۔ اس پر بھٹو صاحب کا ردّعمل واضح تھا بہرحال یہ سازش کارگر ہوئی اور پھر جو ہوا سو ہوا مگر ان سازشیوں کا کچھ نہیں گیا وہ واپس اپنے گھر آ گئے۔ البتہ قوم کو اس کا خمیازہ بہت وسیع پیمانے پر بھگتنا پڑا ہے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ

بھٹو صاحب کی خواہش

بھٹو صاحب کی یہ خواہش کوئی راز نہیں تھی کہ میں اگر پی پی میں نہیں جا سکتا تو کم از کم اتنا ہو جائے کہ مسلم کانفرنس کا نام ہی تھوڑا سا تبدیل کر کے اس کے اول میں "پیپلز" کا لفظ آ جائے۔ یعنی بجائے محض آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے وہ آل جموں و کشمیر پیپلز مسلم کانفرنس ہو جائے۔ انہوں نے مجھے کئی بار برملا کہا "اگر ایسا کر لو تو تمام انتخابات اپنی مرضی سے کراؤ، روپیہ پہلے سے زیادہ مرکز سے ملے گا اور اختیارات بھی پہلے سے زیادہ ہوں گے" یہ ان ہی کے الفاظ ہیں۔ یہی بات مجھ سے خود کہنے سے قبل وہ

Marfat.com

اپنے دوستوں اور بعض سرکاری افسروں کے ذریعہ مجھے کئی بار کہلوا چکے تھے میں نے جواباً یہ کہا "اس بات پر ہم سنجیدگی سے غور کریں گے مگر ایک تو اس وقت عین انتخابات کا وقت ہے، یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ دوسرے اس میں صرف میری رائے نہیں بلکہ جماعت کے نئے اور پرانے سب کارکنوں کا مشورہ ضروری ہے۔ لیکن اس پر ہم صرف انتخابات کے بعد ہی غور کر سکتے ہیں، پہلے نہیں۔" مگر خدا جانے ان کے خیال میں کیا بات تھی وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا خیال شاید یہ ہو کہ ہم لوگ محض دفع الوقتی کے لئے انتخابات کے بعد کی بات کرتے ہیں اور یہ بہت حد تک صحیح بھی تھا۔ کیونکہ ہماری تاریخ ساز جماعت کا نام تبدیل کرنے کا تصوّر بھی ہمارا کوئی ادنیٰ سا کارکن بھی نہیں کر سکتا تھا، کون اس قدر تابناک اور درخشندہ ماضی کی پوری تاریخ سے ہی محض چند روزہ اقتدار کیلئے اپنا رشتہ ہی کاٹ دے اور پھر ایک غیر یقینی مستقبل میں آوارہ گردی کرے"؟ سیاسیات کا یہ وہ باریک اور گردابی نکتہ ہے جہاں بے شمار کشتیاں نیچے گئیں اور غرق ہو گئیں، خصوصیت کے ساتھ وہ جماعتیں اور کارکن جو کسی نظریئے اور عقیدے پر چل رہے ہوں اور اس پر یقین رکھتے ہوں، ان کیلئے تو یہاں سامان موت ہے وہ تو پھر محض آوارہ گردی تو کر سکتے ہیں مگر زندگی کو کسی بامقصد نتیجے تک نہیں پہنچا سکتے۔ ان کی تمامتر صلاحیتیں اور خوبیاں محض ایک بار گراں بن کر رہ جاتی ہیں۔

اس وقت تو یہ بات شاید بہت اصولی اور بنیادی دکھائی دیتی ہو مگر اُس وقت ایسی نہ تھی میرے خیال میں بات کچھ اور بھی تھی۔ میں آزاد کشمیر میں پاکستانی سیاست کو اس طرح داخل کرنا قومی مقاصد کے خلاف سمجھتا رہا ہوں۔ سہروردی مرحوم اور فیلڈ مارشل مرحوم کے ساتھ اسی بات پر بہت تفصیل سے بات ہو چکی تھی، سہروردی مرحوم تو اپنی عوامی لیگ کا دائرہ کار یہاں تک لے ہی آئے تھے تو دوسرے صاحب مسلم لیگ میں مسلم کانفرنس کو ضم کرنے کا سوچ رہے تھے۔ مگر میرے ساتھ بات کرنے کے بعد دونوں نے اس کو نقصان دہ اور نامناسب سمجھا اور وہ ارادہ ترک کر دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس صدارت کو اتنی سی لچک کے ساتھ بچا سکتا تھا اور آزاد کشمیر میں جس کام کی بنیاد میں نے رکھ دی تھی، اگر مکمل نہ سہی لیکن کچھ اور آگے ضرور بڑھ جاتا اور ایک زمانے کیلئے یادگار ہوتا یعنی نفاذ شریعت اور آزاد کشمیر کی ترقی و تعمیر اور اس کو صحیح معنوں میں تحریک آزادی کشمیر کا بیس کیمپ بنانا۔

دوسرے مرحلے پر اس بات نے ایک اور رخ اختیار کیا کہ مسلم کانفرنس بھی رہے مگر ان کی جماعت پی پی کو بھی حکومت میں شامل کیا جائے۔ میرا عقیدہ اگرچہ وہی تھا اور اب بھی وہی ہے مگر ایک بڑے فساد کو ٹالنے کیلئے جس کے خلاف میں یکہ و تنہا لڑ رہا تھا اس پر ان کے ساتھ مفاہمت کی بات چیت شروع ہو گئی۔ مگر بدقسمتی سے یا حسن اتفاق سے ایک اور بنیادی اصول زیر بحث آ گیا میرا موقف یہ تھا کہ سب لوگ انتخابات میں حصہ لیں پھر جو نتائج ہوں اس کے مطابق دونوں جماعتوں کی ایک مشترکہ حکومت بنالی جائے۔ مگر نہ جانے ان کے دلوں میں کیا شبہات تھے تو وہ اس بات پر مصر تھے کہ اسمبلی کی چالیس سیٹوں

Marfat.com

سردار عبدالقیوم، عبدالحفیظ پیرزادہ اور ذوالفقار علی بھٹو

Marfat.com

میں سے دس ان کو دے دی جائیں۔ دیکھئے ' حکومت ہی اگر میرا مقصود ہوتا تو یہ مشکل تھا نہ کوئی مہنگا سودا تھا، لیکن جب اس پر بھی اتفاق نہ ہو سکا تو خود بھٹو صاحب کے ہاں ایک میٹنگ ہوئی، جس میں پیرزادہ صاحب ' یوسف بچ '، اجلال حسین اور شاید ایک دو آدمی اور تھے جن کا مجھے صحیح یاد نہیں، وہ تلخی کا ماحول تھا بھی کچھ ایسا ہی۔ غالباً یہی میٹنگ ہماری فیصلہ کن تھی۔ گفتگو مختصر مگر دلچسپ۔ حفیظ پیرزادہ نے کہا "جناب ہم سردار صاحب سے چالیس میں سے صرف دس نشستیں مانگتے ہیں مگر یہ اس کیلئے رضامند نہیں ہیں" وزیراعظم نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "یہ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ اس میں ایک دو اصولی باتیں ہیں۔ آپ خود ان پر فیصلہ صادر کر دیں تو مجھے منظور ہے" "وہ کیا ہیں" انہوں نے پوچھا۔ میں نے کہا "ایک یہ کہ آزاد کشمیر میں چالیس میں سے صرف دس نشستیں اور پیپلز پارٹی کے چند لوگ ہی کیوں وزیراعظم پاکستان کے ساتھی ہوں۔ ہم سب لوگ جو وزیراعظم کے ساتھ ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ ہی سب سے زیادہ جمہوریت اور عوام کی بات کرتے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اندر بیٹھ کر لوگوں کو تقسیم کر لیں اور ان کو ان کے جمہوری حق سے محروم کر دیں؟ نیز آپ صرف ۱۰ ہی سیٹیں کیوں لیتے ہیں ' سب کیوں نہیں لے لیتے؟" میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائے اور کہنے لگے "نہیں، میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ آپ لوگ خود ہی کر لیں"۔ بس ایک دو باتیں اور ہوئیں جو پھر کسی وقت انشاءاللہ ذکر کروں گا۔ مجلس برخاست ہو گئی اور میں واپس چلا آیا۔

جب انتخابات بالکل قریب آ گئے تو ان کا فون آیا۔ کہنے لگے "میرا مشورہ یہ ہے کہ استعفیٰ دے کر انتخاب لڑو اور ہمارے بارے میں کوئی بدگمانی نہ کرو" میں نے کہا "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں مل کر اس بارے میں کچھ گذارش کروں" کہنے لگے "ٹھیک ہے کل پشاور آ جاؤ" پشاور کی میٹنگ میں پیرزادہ بھی تھے۔ بہت اچھے ماحول میں بات ہوئی آخر میں مجھ سے کہا "اچھا آپ اسی طرح رہیں اور انتخابات بھی لڑیں کوئی ناراضگی نہیں ہے۔ ہم بھائی ہیں" پھر کچھ ہی دنوں میں بدقسمتی سے ایسا واقعہ ہوا کہ ہم لوٹ کر اسی تلخی کے ماحول میں چلے گئے۔

اقتدار سے جبری علیحدگی کے بعد مصالحت کی پیش کش

مجھے جس وقت صدارت سے جبراً ایف ایس ایف کے ذریعہ نکالا گیا تو میں راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ سترہ میل کے مقام پر میاں عباس مرحوم اور میرے محترم بھائی روزنامہ "وفاق" کے ایڈیٹر مصطفیٰ صادق صاحب نے ہمیں روکا۔ میاں عباس نے غالباً کہا "پیرزادہ صاحب کی خواہش ہے کہ سیدھے میرے پاس آئیں"۔ میں نے اس کا جواب دیا ' جو دیا۔ کبھی مصطفیٰ صادق صاحب نے اس کا ذکر کیا تو کریں گے اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مصطفیٰ صادق صاحب کو بھی یاد ہو گا وہ کبھی اپنی یادداشتیں قلمبند کریں

Marfat.com

گے تو شاید ذکر کر ہی دیں۔ مصطفےٰ صاحب میرے ساتھ بیٹھ گئے اور کہنے لگے "پیرزادہ کہتا ہے کہ اب بھی کچھ نہیں گیا سب بات درست ہو سکتی ہے"۔ میں نے کہا "یہ لوگ مجھے بہت غلط سمجھتے ہیں۔ میں صرف صدارت کے معاملات کو ہی سب سے زیادہ اہم نہیں سمجھتا۔ وہ بات ختم ہو گئی ہے۔ اب ملاقاتوں میں تلخی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا"۔ اس طرح ہم پیرزادہ کے پاس جانے کے بجائے سیدھے کاکا جی ہاؤس چلے گئے جہاں ہم نے پروگرام کے مطابق جانا تھا۔

ایک اور مرتبہ چند دنوں بعد ایف ایس ایف کے چیف، مسٹر مسعود محمود سے اسلام آباد والی سڑک پر ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے "میں یہ قریب میں رہتا ہوں اگر پسند کرو تو وہاں بیٹھ کر بات کریں"۔ جب میں نے بوجوہ انکار کر دیا تو کہنے لگے "میری غرض یہ تھی کہ وہاں سے سبز فون پر وزیراعظم کے ساتھ آپ ایک بار صرف ہیلو ہیلو کر لیں تو باقی بات میں خود کر لوں گا"۔ اس کو بھی میں نے وہی مصطفےٰ صاحب والا جواب دیا اور انکار کر دیا پھر ہم پر کیا گزری وہ بجائے خود ایک طویل مگر معروف داستان ہے جو کچھ ہم پر فعلاً گزری اس کے علاوہ جو منصوبے ہمارے بارے میں بنائے جاتے رہے وہ بجائے خود ایک الگ داستان ہے۔

گھر پر میری نظر بندی کے دوران جب وزیراعظم مظفر آباد آئے تو ان کے کچھ نمائندے میرے پاس آئے۔ خاص کر میجر اورنگ زیب، کہنے لگے "وزیراعظم تمہارے گھر آنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے وہ تمہارے دو دوستوں کو بھی ہمراہ لا رہے ہیں مولانا کوثر نیازی اور مصطفےٰ صادق" میں نے کہا "اگر وہ ایک بھائی کے گھر آنا چاہتے ہیں تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ کوئی سیاسی مقصد لے کر آ رہے ہیں تو میں معذور ہوں۔ نظر بندی کے دوران میں کوئی سیاسی بات نہیں کروں گا" پھر وہ تو نہ آئے لیکن میں بھٹو صاحب کا بہر حال شکر گزار ہوں کہ اس تلخ ماحول کے باوجود اور باوجود اس کے کہ وہ لحاظ بہت کم کرتے تھے، انہوں نے مظفر آباد کے دورے کے دوران میرے خلاف کوئی ذاتی بات نہ کہی، جو کی بھی تو ایک شکایت کی صورت میں تعریف ہی کی۔

ناقابلِ تصوّر معاوضہ

پاکستان کے انتخابات جب قریب آ گئے اور میں اس وقت پلندری جیل خانے میں تھا، تو آزاد کشمیر کے اس وقت کے چیف سیکرٹری حسن ظہیر صاحب جن کیلئے میرے دل میں بہت عزت ہے، ایک اور ساتھی کو لیکر اچانک وہاں آ گئے۔ وہ دوسرے صاحب بھی میرے لئے قابل احترام بھائی ہیں۔ مطالبہ یہ تھا کہ میں انتخابات میں بھٹو صاحب کی حمایت کا اعلان کروں جب میں نے اس سے انکار کر دیا تو پھر یہ خواہش کی کہ کم از کم سردار سکندر حیات خان کی، جو ہماری جماعت کے اس وقت قائمقام صدر تھے،

Marfat.com

پاکستان میں قومی اتحاد کے سٹیج سے کی جانے والی تقریروں سے لاتعلقی کا اظہار کروں کیونکہ حکومت ان کی تقریروں سے خاصی پریشان تھی۔ اس کے علاوہ اصل مقصود یہ تھا کہ حسن ظہیر صاحب نے افضل سعید صاحب کا یہ پیغام دیا کہ اگر میں ایسا کر دوں جو وہ چاہتے ہیں تو میرے لئے وہ کچھ کیا جائے گا جس کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا ۔ یہ بات بھٹو صاحب کے ساتھ منسوب کر کے مجھے سنائی گئی۔ بالکل یہی تھے وہ الفاظ جو مجھے سنائے گئے میں نے ظہیر صاحب سے کہا کہ پہلے تو میں اس پیشکش کے بارے میں کچھ بات کر لوں۔ پہلی بات جو میں ان سے کہنا چاہتا تھا اور معاً میرے خیال میں آئی تھی وہ تو میں نہ کہہ سکا کیونکہ ادب مانع تھا۔ مجھے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانیؒ کے وہ شعر یاد آرہے تھے جو انہوں نے سلطان سنجر کی طرف سے جاگیر کی پیشکش کے جواب میں تحریر فرمائے تھے۔ ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

مگر حضرت غوث الاعظمؒ کے ساتھ اپنی ایسی نسبت کرنے سے مجھے شرم آئی۔ وہ تو نہ کہا مگر میں نے کہا "آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، آپ ان کو بھی سنائیں، شاید ان کی سمجھ میں آجائے" میں نے کہا "ان سے کہنا کہ وہ مجھے بالکل نہیں جانتے۔ ان کو کیا معلوم ہے کہ میرے خیال کی وسعتیں اور حدیں کیا ہیں۔ اگرچہ میں بہت گنہ گار شخص ہوں مگر کچھ ایسے لوگوں کی خدمت میں چند لمحے رہا ہوں جو ہماری مادی حدود وقیود سے بہت آگے ہیں۔ وہ جو حضرت سعدیؒ نے کہا ہے۔ ؎

بگفتا من گلے ناچیز بودم
و لیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

میں نے انہیں سنایا "وہ بات یوں ہوئی کہ ایک عرصہ دراز سے کسی شیطانی وسوسہ کے باعث میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ مسلمان فقراء عموماً امی ہوتے ہیں۔ ان کو زندگی کے مادی اور ظاہری معاملات کے بارے میں کتنا علم ہوتا ہو گا؟ جبکہ ان کے مقابلے میں ہندو فقیر عموماً بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں، اس لئے وہ اپنی قوم کی امداد کرتے ہیں"۔ ایک دن اتفاق سے میں مری روڈ پر رہنے والے ایک فقیر "باباجی صاحب" جن کو ہم ایک بار اکٹھے بھی ملے تھے، جب آپ ابھی مشیر تھے، کے پاس بیٹھا تھا تو انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا "دیکھو جی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمان فقیر ان پڑھ ہوتے ہیں اور ان

Marfat.com

کو کچھ معلوم نہیں ہوتا وغیرہ .... (جو میرا خیال تھا) " کہنے لگے " اگر کوئی شخص صحیح معنوں میں فقیر ہو تو یہ جتنی خدا کی خدائی ہے، 'سب مل کر بھی اس کے دل کے ایک گوشے کو بھی نہیں بھر سکتی " میں نے حسن ظہیر سے کہا کہ افضل سعید کو یہ بات سنا دیں، 'وہ اپنے علم اور معلومات کی وسعتوں پر مجھے قیاس نہ کریں " ۔ دوسرا میں نے کہا " ان سے کہنا کہ میں اس معاملے میں ویسے بھی بہت غلط آدمی ہوں ۔ میرے ساتھ لین دین کی زبان میں بات نہ کریں تو اچھا ہے ۔ البتہ میں نے حسن ظہیر صاحب سے کہا " بھٹو صاحب انتخابات جیت جائیں گے، مگر وہ جیتیں یا ہاریں، ہر دو صورتوں میں بعد از انتخاب کے عرصہ میں انہیں میری ضرورت پڑے گی " وہ لوگ واپس چلے گئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ پھر آ گئے ۔ مجھے سہالہ پہنچانا چاہتے تھے، تب کہنے لگے " اس وقت تو تمہاری بات محض ایک بڑ معلوم ہوتی تھی مگر اب وہ سچ ثابت ہو رہی ہے ۔ آپ کو سہالہ بھی جانا ہے اور وزیر اعظم سے بھی ملنا ہے " منجملہ دوسرے اعتراضات کے جو مجھے اس مجوزہ ملاقات کے بارے میں تھے، میں نے ان سے کہا " بھٹو صاحب نے سردار قیوم کو صدر کی حیثیت سے دیکھا ہے ۔ ایک آزاد آدمی کی حیثیت سے نہیں دیکھا ۔ ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں پر ہی عتاب آ جائے " انہوں نے جواباً جو کہا وہ صحیح ثابت ہوا ۔ انہوں نے کہا " آپ بھی صدر نہیں ہیں مگر بھٹو بھی وہ پہلے والے نہیں ہیں " ۔

ناقابل یقین اعتماد کا اظہار

اس واقعہ میں جو دوسری بات بتانا مقصود تھی کہ ملاقات کے دوران بھٹو صاحب نے آزاد کشمیر کا قصہ چھیڑا اور میرے ساتھ کی گئی زیادتی کا ذکر کیا تو میں نے ان سے کہا کہ " میرے نزدیک وہ بات ختم ہو گئی ہے، مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے وہ بات اب زیادہ اہم نہیں ہے جبکہ پورا ملک سنگین حالات سے دوچار ہے ۔ اس بارے میں اگر کوئی بات ہو تو مجھے بتائیں " ۔ انہوں نے آزاد کشمیر کے بارے میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش میں کم از کم پندرہ منٹ صرف کئے ہوں گے ۔ جب میں نے بہت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں آزاد کشمیر کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا " ۔ اس پر انہوں نے قومی اتحاد کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ تقریباً سب بتایا جو بنیادی باتیں تھیں پھر آخر کہنے لگے " میں نے اپنی ساری بات تمہیں بتا دی ہے ۔ اب میرا استعفیٰ تمہارے ہاتھ میں ہے، چاہو تو کل جا کر اس کا اعلان کر دو " ۔ یہ ایسی بات تھی کہ نہ تو میں اس کیلئے تیار تھا نہ میں فوراً اس کا کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں تھا ۔ اسی پر ملاقات ختم ہو گئی اور میں واپس چلا گیا ۔ مفتی صاحب مرحوم کو سہالہ جا کر سارا قصہ بتایا ۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں کہ بھٹو صاحب نے مجھے کیوں بلوایا اور مجھ پر، بظاہر ہی سہی، 'اتنا اعتماد کیوں کیا ۔ وہی زندہ ہوتے تو اس بارے میں صحیح بات بتا سکتے تھے ۔ البتہ ایک بات ایسی ہے جو میرے خیال میں اس کا ایک محرک ہو سکتی ہے جیسا کہ میں اب تک سمجھتا

Marfat.com

ہوں۔ اس کا ذکر میں مذاکرات کے ضمن میں کروں گا اِن شاء اللہ۔

صدارت کی پیشکش

مذاکرات سے قبل ان کے ساتھ میری چند ملاقاتیں تو ہوئیں مگر شومئی قسمت کہ بعد میں ہم نہ مل سکے۔ ان ملاقاتوں میں دو تین بار انہوں نے برملا مجھے یہ کہا کہ میں واپس اپنی پوزیشن پر چلا جاؤں یعنی مظفر آباد جا کر بحیثیت صدر کام کروں۔ یہ بات یقیناً آپ کے علم میں بھی ہو گی۔ ایک بار تو میں نے ان کی پیشکش کے جواب میں یہاں تک کہا کہ وہاں جو لوگ ہیں وہ بھی ہمارے بھائی ہیں۔ اختلافات جو بھی ہوں مگر میں ان کی جگہ اس طرح کبھی بھی نہیں جاؤں گا۔ ''آزاد کشمیر کی صدارت کی پیشکش انہوں نے اس دوران معلوم نہیں کتنی بار کی ہو گی۔ اگر مجھے صدارت مقصود ہوتی تو پھر اس سے اچھا موقع اور کون سا تھا۔''

منصفانہ انتخابات۔ نتائج کا خوف

ایک اور موقع پر میں نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کے بارے میں بات کی تو کہنے لگے ''اچھا آپ میرا ساتھ دیں۔ میں کل ہی اعلان کر دیتا ہوں'' اس پر ہم دونوں ہنستے رہے۔ میں نے کہا ''اولاً تو اگر میں نے ایسا کرنا ہوتا تو میں یہ صدارت کی قربانی کے علاوہ اٹھارہ مہینے جیل میں کس خوشی میں گزارتا۔ دوسرے یہ کہ آپ کو میرے ساتھ کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ اس کے بغیر ہی انتخاب جیت جائیں گے'' میرا تاثر بھی یہ ہے کہ ان کے بعض ایسے دوستوں نے جو خود انتخاب نہیں جیت سکتے تھے ان کو یہ باور کروایا تھا کہ منصفانہ انتخابات ہوئے تو بس تباہی آ جائے گی۔ میرا پختہ یقین ہے کہ وہ بہر صورت انتخاب جیت جاتے اس پر ان کے ساتھ بہت تفصیل سے بات ہوتی رہی پھر کبھی موقع ملا تو اس کا بھی ذکر کروں گا۔ پھر کہنے لگے ''اچھا آپ پی این اے سے علیحدہ ہو جائیں'' میں نے کہا ''جناب میں غریب آدمی ہوں، میرا یہی کچھ اثاثہ ہے کہ میں بد عہدی اور بد اخلاقی کا مرتکب نہیں ہو سکتا''۔ پھر کہنے لگے ''اچھا۔ آپ پی این اے کی طرف سے جلسوں میں تقریریں نہ کریں'' میں نے کہا ''یہ تو اس سے بھی بد تر ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ لمبی بات تھی۔

مذاکرات پر آمادگی اور معاوضے کی پیشکش

پھر جب میں پی این اے کے تمام مرکزی زعماء سے مل کر واپس آیا اور بھٹو صاحب کو بتایا کہ سب لوگ مذاکرات کیلئے آمادہ ہیں تو کچھ حیران سے ہو گئے۔ ایک ایک کا پوچھا، وہ بھی راضی ہے، فلاں بھی

Marfat.com

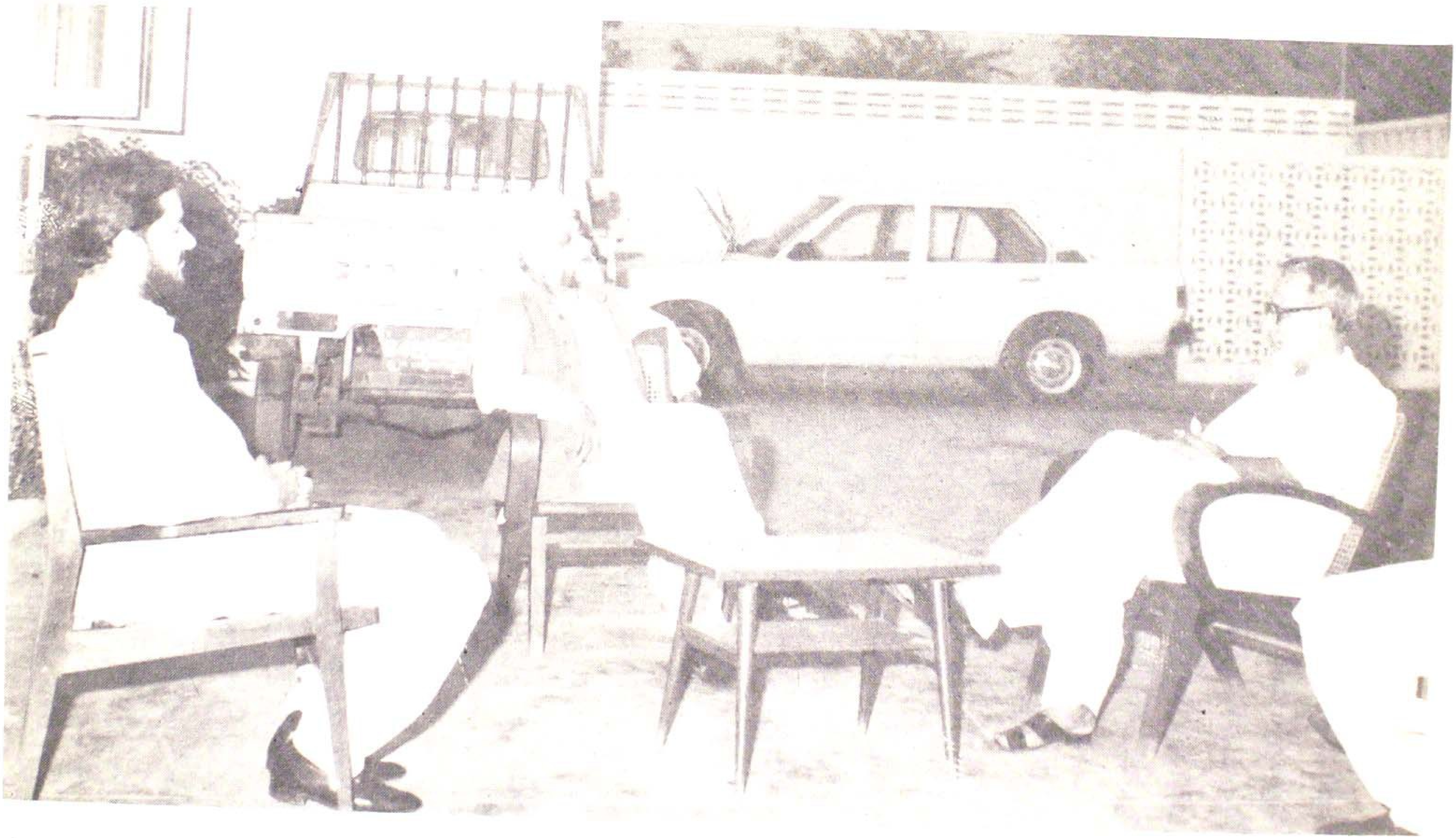

پروفیسر غفور احمد، سردار عبدالقیوم اور سردار عتیق احمد

Marfat.com

راضی ہے ' فلاں بھی۔ میں نے جب کہا کہ سب راضی ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے کہنے لگے۔ سردار قیوم میں دو باتوں کیلئے آپ کا بہت شکر گزار ہوں ایک تو یہ کہ آپ نے میری پوزیشن کا پورا خیال رکھا (مطلب یہ تھا کہ میں نے ان دنوں میں کوئی ایسی بات اخبارات کو نہیں کہی جس سے وزیر اعظم کی سبکی ہوتی بلکہ میں نے الٹا اخبارات کو گہری سوچ میں ڈال دیا تھا) اور دوسرے یہ کہ مذاکرات کیلئے میری بہت مدد کی "بتاؤ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں"۔ یہ جو ان کی پوزیشن کی بات تھی ' تو میرے خیال میں میری اس دوڑ دھوپ میں سب سے مشکل کام یہی تھا جب میں سفر پر روانہ ہونے لگا تو بھٹو صاحب نے مجھ سے صرف یہی ایک بات کہی تھی "میری پوزیشن کا خیال رکھنا" سو خدا نے کیا کہ ان کے اس اعتماد کو ٹھیس نہ لگی ' ورنہ اخبار نویس حضرات کیا کیا نہیں کہلوا لیتے۔ مگر اس میں ان کو بے حد ناکامی ہوئی اور ہم لوگ مذاکرات کے قریب ہو گئے۔ جب انہوں نے کہا "بتاؤ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں" تو میں اس کو محض جذباتی ردِ عمل سمجھ کر ٹال گیا۔ انہوں نے اس کو پھر زیادہ زور سے جب دھرایا تو مجھے اس سے صدمہ ہوا۔ میں نہ رہ سکا اور ان سے کہا "جناب وزیر اعظم! ہر شخص کسی معاوضے کے خیال سے ہی کام نہیں کرتا۔ آپ معاوضے کی زبان میں کیوں مجھ سے بات کر رہے ہیں۔ میں اگر سمجھتا کہ ایسا کرنے میں قوم کا فائدہ نہیں یا نقصان ہے تو میں کبھی بھی اس میں شامل نہ ہوتا۔ میرا آپ پر کوئی احسان نہیں ہے۔ اگر آپ احسان سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی مہربانی ہے" اسی پر بات آئی گئی ہو گئی۔

عفو و تعزیر

مجھے بڑے زعماء کا تو علم نہیں ہے مگر میرا اب بھی خیال ہے کہ میری سطح کے کسی شخص کیلئے بھٹو جیسے شخص کے سامنے بیٹھ کر جبکہ وہ ایسے معاملات میں نہ صرف حساس تھے بلکہ اپنی عزت و بے عزتی کی بات سمجھتے تھے ' اس طرح ان کی ایسی جذباتی پیشکش کو مسترد کر دینا آسان بات نہیں تھی۔ آج تو کوئی جو چاہے کہے۔ آج تو ہر لنڈی (دم کٹی) ' بچی (ناک کان کٹی) پر دھان ہے۔ اسی سے یاد آیا کہ جب بھٹو صاحب کے بعد تمام سرکاری ملازمین کو ان سے تعاون کرنے کی پاداش میں تھوک کے حساب سے ذبح کیا جانے لگا تو میں نے ایک جرنیل وزیر سے کہا "ایسا نہ کریں۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔ ملازمین جہاں بہت طاقتور دکھائی دیتے ہیں ' وہاں کمزور بھی ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ"۔ "اول تو سب کو اصلاح کا موقع دیں ورنہ اچھے برے کی تمیز کریں۔ میرے خیال میں ہمارے ہاں برائی کرنے کے خواہشمند کم ہیں اور اچھائی کرنے کے خواہشمند زیادہ ' بشرطیکہ ان کو کوئی اچھائی کرنے دے" ان کو یہ برا لگا اور سختی سے کہنے لگے "تو پھر اخلاقیات کیا ہوتی ہے" میں نے نرمی سے کہا "جناب آپ اس خاکی وردی کے قلعہ میں محفوظ ہیں اس کو اتار کر اپنے آپ کو اس دور میں پہنچائیں اور پھر یہ بات کہیں تو میں مان لوں گا" خدا ان کا بھلا کرے '

Marfat.com

نرم ہو گئے کہنے لگے "آپ ٹھیک کہتے ہیں" رسول اللہ صلی اللہ و سلم کا ارشاد مبارک ہے "فَاِنَّ الْاِمَامَ لَاَنْ یُّخْطِیئَ فِی الْعَفْوِ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یُّخْطِیئَ فِی الْعُقُوْبَۃِ" امام کیلئے معاف کرنے میں غلطی کرنا سزا دینے میں غلطی کرنے سے بہتر ہے" خدا ہمیں ان امور کی سمجھ عطا فرمائے۔

حکومت اک بارِ امانت

اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہم میں سے کون کتنے پانی میں ہے۔ نیز یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ میں نے اس پوری سیاسی زندگی میں کسی مرحلہ پر بھی حکومت حاصل کرنے کی غرض سے خدا کے فضل و کرم سے کبھی سودا بازی نہیں کی سودا بازی تو در کنار، میں نے کسی نرمی یا جھکاؤ کا بھی اس کے فضل و کرم سے مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی تو میرا یقین ہے کوئی عقل و انصاف والا انسان کبھی بھی تردید نہیں کر سکے گا، پھر ایک سیدھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے مادی منفعت کے سرچشمہ "حکومت" کے حصول کیلئے تو سودا بازی نہ کی، مگر بقول صاحبزادے کے چند کھوٹے سکّوں کے عوض ایسا کیا، جبکہ حکومت کے حصول کیلئے تو لوگ دین، ایمان، بیوی، بچے، جان و مال غرضیکہ ہر چیز داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اس کو قبول نہ کرنے کا کوئی تو معقول سبب ہونا چاہئے۔ میں نا اہل تھا یا دیوانہ؟۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً ایسا نہیں، تو پھر تیسری وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کہ مجھے خدا کے فضل و کرم سے اپنے اصولوں اور قضا و قدر پر مکمل یقین و ایمان ہے۔ ساتھ ہی مجھے حکومت کی ذمہ داریوں اور اس کے اصل نتائج و عواقب کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہے۔ میں تو کار حکومت کو دنیا میں سب سے بڑی امانت سمجھتا ہوں اور تاوقتیکہ اللہ تعالٰی کسی کی امداد اور رہنمائی نہ فرمائے، کوئی بھی اس ذمہ داری سے کماحقہ عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس واقعاتی حوالے سے ایسے لغو الزامات کو دیکھا جائے تو یہ خود اپنی تردید آپ ہیں۔ مگر میں انسانی کردار کے اس پہلو کا بھی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور کیوں نہیں ہوتا اور کیا اس مادی دور میں ایسا ممکن بھی ہے؟

حکومت و دولت کے مظاہر

پہلی توجہ طلب بات تو یہ ہے کہ حکومت ہو یا دولت، مادی دولت ہو یا ایمان کی، ہر ایک کی کچھ علامات، نشانیاں اور مظاہر ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ لامحالہ اپنا اظہار چاہتی ہیں۔ ان کو پردے میں رکھا ہی نہیں جا سکتا، نہ چھپایا جا سکتا ہے۔ جس طرح حکومت کی واضح علامات ہیں عین اسی طرح ایمان ہو، حسن ہو یا دولت، ان کی بھی اپنی ناقابل اخفاء علامات ہیں۔ جہاں روپیہ ہو گا، وہاں مکان، تجارت، کاروبار، موٹریں، گاڑیاں، بنکوں میں رقوم، رہنا سہنا، دوست یار، بیگمات، مربعے، جاگیریں، ٹھیکیداریاں اور اس قسم کی بے شمار الابلا تو روپے پیسے کا وہ لازمہ ہے جس کے بغیر آج تک اس کا کوئی تصوّر

Marfat.com

نہیں ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے پھر یہ کہ روپیہ صرف اپنے پجاریوں سے ہی محبت کرتا ہے جو لوگ اس کو ایک خدائی امانت، دوسروں کا حق اور محض ایک ذریعہ سمجھتے ہیں 'ان کے پاس نہ تو وہ جاتا ہے' نہ ٹکتا ہے۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ اس طرح دولت حاصل کریں 'کیا دوسرے لوگ ان کیلئے اپنی جانیں قربان کر سکتے ہیں؟ کیا ان کی بات میں کوئی تاثیر ہو سکتی ہے؟ اگر ان تمام ظاہری علامات سے دولت کا کوئی پتہ نہ چلے تو پھر عالم غیب میں کوئی بات ہو تو ہو 'مگر اس مادی دنیا میں تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔

استغناء کی نعمت

روپے پیسے کیلئے سودے بازی صرف وہ شخص کرتا ہے جس کی زندگی کا مقصود ہی روپیہ پیسہ ہو۔ میری زندگی کا مقصود تو بہرصورت نہ کبھی دولت تھی 'نہ ہے۔ (یا پھر اگر کسی کو معاشی مجبوری ہو اور گھر والوں کی ذمہ داری سے پریشان ہو' مجھ پر تو پروردگار عالم نے اس معاملہ میں دوہری کرم نوازی کی ہوئی ہے۔ ایک یہ کہ ایسی قطعاً کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اگرچہ میرے اپنے کوئی وافر ذرائع نہیں ہیں تاہم میرے مخلص دوست اور عزیز ایسے ہیں کہ مجھے کبھی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ پھر بھی میں ان کی طرف سے کی جانے والی ہر بات کو خدائے پاک کی جانب سے ہی سمجھتا ہوں۔ جن کو وہ مالک پسند کرتا ہے میرے معاملات میں توفیق عطا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر میں بھی چاہوں اور وہ بھی چاہیں 'تب بھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے اس معاملہ میں دیکھا ہے کہ کچھ دوست جو میرے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے' خدائے تعالیٰ نے اچانک ان کے ذرائع ہی سلب کر لئے۔ پروردگار عالم کی ایک نوازش تو یہ ہے اور دوسری وہ جو اس سے بھی سوا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو اس قید و بند سے بالکل آزاد کر دیا ہے یہاں تک کہ میں اپنے کسی معاملہ میں خود کو محتاج نہیں سمجھتا۔ وہ جب چاہتا ہے' خود ہی اسباب فراہم کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے' سلب کر لیتا ہے۔ زندگی کا یہ ایسا باب ہے جس پر اختصار سے ہی سہی مگر چند باتیں کہنا ضروری ہیں اور اسی میں شاید چھٹہ صاحب کے اشکال کا بھی جواب مل جائے گا۔

اقتدار کے تقاضے اور شرمناک انتخابی دھاندلی

حکومت کے بارے میں تو میری یہ سوچ قطعی اور مستقل ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ اور اس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہے (ان پورے معنوں میں جو اس ایمان کا اساسی تقاضا ہیں) اس کو کار حکومت کے سلسلہ میں اپنے خیالات اور خواہشات کو پورے خلوص اور دیانتداری سے پوری طرح سوچ سمجھ کر ایک نظم کے اندر ڈھال دینا چاہئے۔ اس کو مزید واضح کرنے کیلئے اسے پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اولاً تو اس کا استحقاق کیا ہے کہ اس کو حکومت ملے یا وہ کار حکومت میں شریک ہو؟' دوسرے یہ کہ

Marfat.com

وہ طریقہ کار کیا ہے جس سے اس کو وہ مرتبہ ملنا چاہئے؟ اور تیسرے یہ کہ وہ کب تک حکومت پر رہے اور کیوں؟ میرا پختہ خیال ہے' زیادہ تر اپنے لئے کہ جب تک یہ تین باتیں ذہن میں واضح نہ ہوں گی' اس وقت تک کسی کا یہ رٹ لگانا کہ میری سیاست اسلام پر ہے اور اسلام کے لئے ہے' عملاً بے معنی بات ہوگی۔ کوئی فرق نہیں ہے پھر لادین سیاست میں اور بزعم خود دینی سیاست میں۔ چنانچہ خدائے برتر کی عنایت سے عطا کردہ سوچ اور خواہش کے مطابق میں نے ان تینوں بنیادی تقاضوں کے ضمن میں ہمیشہ ایک واضح طرز عمل اختیار کیا۔ الحمد اللہ علیٰ ذلک۔ یہ اسی کا کرم ہے کہ میں نے نہ صرف یہ کہ حکومت کیلئے ہمیشہ اپنے آپ کو موزوں ترین شخص نہیں سمجھا بلکہ اس کے حصول کے ذرائع کی پاکیزگی کو بھی قائم رکھا اور حکومت پر برقرار رہنے کیلئے ایک بال کی نوک برابر بھی کوشش نہیں کی' خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔ بعض باتیں اگرچہ کھینچ تان کر کسی تاویل کے ذریعہ جائز قرار دیجا سکتی ہیں' مگر میرے دل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کے مطابق کہ دَعْ مَایُرِیْبُکَ اِلیٰ مَالاَ یُرِیْبُکَ ان کو بھی مشکوک و مشتبہ سمجھ کر ناجائز کی طرح ہی قطعی طور پر رد کر دیا۔ بلکہ خدا کے فضل و کرم کی مدد کے باعث اس سے بھی ایک دو قدم اور آگے رہا ہوں۔

جب پہلی بار صدر پاکستان فیلڈ مارشل مرحوم کے وقت میں نے الیکشن میں حصہ لیا تو کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے قبل میں وزیر امور کشمیر سید اختر حسین صاحب کے پاس گیا۔ میں نے حکومت کے ساتھ اپنی سیاسی تلخیوں کے پس منظر میں ان سے کہا کہ اگر ان کی حکومت کا یہ خیال ہو کہ وہ مجھے بحیثیت صدر گوارا نہیں کر سکتے یا میرا صدر بننا کسی قومی مفاد کے منافی ہے تو مجھے آج یہاں بتا دیں تا کہ میں انتخاب میں کھڑا ہی نہ ہوں۔ "اور یہ معاملہ" میں نے کہا "صرف میرے اور حکومت کے درمیان ہو گا۔ اس کی کوئی تشہیر مطلوب نہیں ہے"۔ لیکن' میں نے ان سے کہا "حکومت اگر میرے خلاف کوئی سازش کرے گی تو اس سے تلخیاں اور زیادہ ہو جائیں گی" خدا ان پر رحم کرے۔ انہوں نے باقاعدہ کلمہ شریف پڑھا اور قسم کھا کر کہا کہ انتخابات غیر جانبدارانہ ہوں گے اور حکومت کو میری صدارت پر بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ مگر بعد میں جو ہوا وہ سب کو معلوم ہے اور جو تلخیاں ہوئیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ اس انتخاب میں جو دھاندلی اور بد دیانتی کی گئی' میرا اب تک یقین ہے کہ اس میں سید اختر حسین کا تو کوئی ہاتھ نہ تھا' وہ سب کام فیلڈ مارشل کی ہدایات اور شیخ منظور قادر صاحب کے فہم و فراست کا کارنامہ تھا۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ خود فیلڈ مارشل مرحوم کو حقیقت حال کا علم نہ ہونے دیا گیا ہو۔ کیونکہ بعد میں ان کے رویئے میں بے حد تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء میں ہونے والے انتخاب کے نتائج کا انتظار خود فیلڈ مارشل ہم سے بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ کرتے رہے۔ بہرحال دھاندلیاں تو پاکستان میں روز اول سے ہی تقریباً تمام انتخابات میں ہوتی رہی ہیں۔ آزاد کشمیر بھی اس نعمت سے محروم نہیں رہا۔ مگر اس انتخاب کی دھاندلی کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اسکے قواعد و ضوابط میں ہی یہ گنجائش رکھ لی گئی تھی کہ انتخاب کے اعلان کیلئے آخری گنتی کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں نے

Marfat.com

دوسرے دن صبح چیف الیکشن کمشنر سے 'جو جلد ہی پاگل ہو کر مر گیا' پوچھا کہ گنتی کب ہو گی تو اس نے کہا کہ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے نتیجہ باہر بورڈ پر لکھ دیا ہے"۔

اقتدار سے بے نیازی اور حصول اقتدار کا اصول

پھر دوسری مرتبہ جب میں صدر بن گیا تو میں نے بھٹو صاحب سے متعدد بار کہا کہ اگر وہ کسی وقت یہ محسوس کریں کہ ان کے اور میرے درمیان تعاون نہیں ہو سکتا تو وہ خاموشی سے مجھے بلا کر کہہ دیں کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہو گی۔ نہ میں اس کا کوئی دوسرا معاوضہ طلب کروں گا۔ وہ اپنی مرضی کی حکومت وہاں بھی بنا لیں۔ لیکن میں نے کہا "خدا کے لئے آزاد کشمیر کے صدر کے خلاف کوئی سازش نہ کریں"۔ اس کا انہوں نے بہت اطمینان بخش جواب دیا۔ اس کے باوجود اسی دوران ہماری کشیدگی شروع ہو گئی، پھر بھی وہ صدارت کی مدت تک میرے صدر رہنے پر آمادہ ہوئے۔ اس کے بعد بھی میں نے ان سے متعدد بار، غالباً ۵ یا ۶ بار، مجلس میں بھی اور تنہائی میں بھی کہا کہ اگر وہ نہ چاہیں تو میں انتخابات میں حصہ نہیں لوں گا۔ یہاں تک کہ میں نے مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اس بھرپور اور تاریخی اجلاس میں جس میں کہ انتخابات کیلئے صدر اور وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے امیدواروں کا نام تجویز کیا جانا تھا، حتی الامکان کوشش کی کہ مجھے کسی عہدے کیلئے نامزد نہ کیا جائے۔ دو صد کے لگ بھگ عاملہ کے اراکین اس کے گواہ ہیں۔ میں نے ان کو آخر میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت جذبات میں میری بات نہیں مان رہے ہیں مگر ایک مہینے کے اندر اندر ان کو اس فیصلہ پر پچھتانا پڑے گا۔ ابھی مہینہ نہیں ہوا تھا کہ وہ بات سب کے سامنے آ گئی۔

اس وقت یہ بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے سیاسی عقیدے کو محض تبرکاً نہیں اپنایا ہوا ہے بلکہ اس پر اپنے خلوص کے مطابق عمل بھی کرتا رہا ہوں۔ میں نے اپنا استحقاق صرف یہ سمجھا کہ مسلم کانفرنس کا چونکہ حق ہے کہ وہ حکومت سازی میں شریک ہو، اسلئے اگر مسلم کانفرنس کی ہائی کمان اپنی آزاد مرضی سے مجھے ٹکٹ دے، تب ہی میں اس کا حقدار ہوں۔ اگر وہ کسی اور کو دے دے تو میں اسی کو اس کا مستحق سمجھتا ہوں۔ ایک اور بات جو مجھے محسوس ہوتی رہی اور وہ عملاً صحیح بھی ثابت ہوتی رہی وہ یہ کہ جب میں کار حکومت میں دوسروں کی غلطیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دیکھتا ہوں، تو مجھے لامحالہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام یوں نہیں یوں ہونا چاہئے۔ مجھے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ خدا کے کرم سے میں اس قابل ہوں کہ اس کام کو ٹھیک طریقہ سے کر سکوں۔ یہ کسی دوسرے بھائی پر کسی برتری کے احساس کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ایک کام کو سمجھنے اور کرنے کی صلاحیت کے احساس کے باعث ہے جو پروردگار کا عطیہ ہے۔

Marfat.com

پھر میں نے کسی وقت بھی جماعت اور انتخابات کے بغیر حکومت حاصل کرنے کی نہ صرف کوئی کوشش ہی نہ کی، بلکہ بہت واضح مواقع کو مسترد بھی کر دیا۔ تیسرے ضمن میں بھی دیکھیں کہ حکومت کو طول دینے کی کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی، جبکہ اس کو ہر بار آسانی سے طول دیا جا سکتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ لوگ تو حکومت کو طول دینے کی کوششوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔ مگر میں طول نہ دینے کے خیال کی وجہ سے گرفتاریوں اور پریشانیوں کا نشانہ بنا رہا۔ اس تفصیل سے یہ پہلو تو یقیناً واضح ہو جانا چاہئے۔ البتہ جن کی نگاہوں میں انصاف کا حیا نہیں، ان کیلئے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا فائدہ تو ان کیلئے ہے جو سچ اور جھوٹ میں کچھ نہ کچھ تمیز کر سکتے ہیں اور انسانیت کی عظمت کی علامت "عدل وانصاف" کا کچھ مادہ ان کے دل و دماغ میں کار فرما ہو۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

اقتدار کی خاطر ضمیر فروشی اور سودے بازی کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اس وضاحت کے بعد دوسری بات یعنی حکومت سے روپیہ پیسہ یا مراعات حاصل کرنے والا معاملہ خود بخود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ تاہم چونکہ مادی اسباب کے وجود اور انسانی زندگی میں ان کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا، اسلئے اس پہلو کو بالکل علیحدہ کر کے خود اس کے ہی میرٹ کی بنیاد پر دیکھنا چاہئے۔ خاص کر ایسے ماحول میں جہاں بالعموم معمول یہی ہو کہ ہر کام کو مادی منفعت کی غرض سے کیا جا رہا ہو، وہاں اس کے برعکس معاملہ کا سمجھنا اور باور کرنا آسان نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجارت ہو، زراعت ہو، ملازمت ہو، سیاست ہو، دین ہو، مسجد ہو کہ مدرسہ، غرضیکہ ہر شے میں غرض اول ایک مادی منفعت ہو گئی ہے الّا ماشاءاللہ۔ لیکن یہ دنیا خدا کے صاحب ایمان و عقیدہ بندوں سے خالی بھی نہیں ہے۔ اگرچہ ان کا وجود نہ صرف یہ کہ بہت نمایاں نہیں رہا بلکہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔

شیخ کامل کا فیض

مجھ جیسے ناکارہ اور گنہ گار انسان پر پروردگار عالم کی کئی بے پایاں عنایات میں سے ایک اہم کرم نوازی یہ ہے کہ اس نے مجھے اس دنیا میں اپنے ایک برگزیدہ بندے کی طرف رہنمائی فرمائی۔ ایک ایسے بندے کی طرف کہ اگر میں خدانخواستہ اپنی زندگی سے ان کو منہا کر کے اپنے آپ کو دیکھوں تو خود کو محض لق ودق صحرا میں ایک تیزرو، سرگرداں اور آوارہ منزل مسافر کی طرح پاتا ہوں۔ میں نے عام طور پر اس سے احتراز کیا ہے کہ ان کے ساتھ کھلم کھلا اپنی نسبت کا ذکر کیا کروں۔ محض اسلئے کہ اس میں ان کی شخصیت کی عظمت و بلندی کا احساس اور اپنی کوتاہی اور پست ہمتی حائل رہی۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے مجھ میں اس بُعد کا احساس بڑھ رہا ہے۔ آئے دن ان کی بلندیوں اور اپنی کوتاہیوں کا احساس زیادہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ اپنی حیات میں بھی اپنے بارے میں ہر اس بات سے ناخوش ہوتے تھے جس سے کسی

Marfat.com

طرح بھی ان کی توصیف یا تعریف کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ اس لئے میں ان کی روح مبارک سے انتہائی ادب اور دلی معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر شاعر مشرق کی ان سے ملاقات ہوئی ہوتی تو وہ بلاشک نہ نظام خانقاہی سے شاکی ہوتے نہ مزاج خانقاہی کا گلہ کرتے۔ بلکہ ان کو پیر رومی کی تلاش میں شاید قونیہ بھی نہ جانا پڑتا۔ بہرحال میری یہ سعادت پروردگار کے اس ارشاد مبارک کے عین مطابق ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ۔" (ترجمہ۔ "ہماری راہ میں جنہوں نے جدوجہد کی ہے یقیناً انہیں ہم اپنی راہیں سمجھائیں گے") اس میں بھی اگرچہ بحث بہت ہے کہ خدا کے راستے سے کیا مراد ہے؟ جدوجہد کا مفہوم کیا ہے؟ اور ہدایت یا رہنمائی کیا اور کیسے ہوتی ہے؟ اور اس کی ظاہری علامات کیا ہیں؟ تاہم بہت حد تک اس پر اتفاق ہے اور میرے نزدیک بھی یہی درست ہے کہ وہ راستہ نبیوں، رسولوں اور ان کے متبعین کا راستہ ہے جیسا کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کا مقصود ہے۔ وہ مرد درویش منجملہ دوسری صفات کے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے اس دور میں مظہر اتم تھے جو سورۃ طلاق میں ہے کہ "وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ...... الخ" ان کی خدمت عالیہ میں چندروز گزار کر ہی علامہ مرحوم کی اس بات کی بھی کچھ سمجھ آئی کہ ...... "گر بہ اللہ الصمد دل بستہ ای۔ از حد اسباب بیرون جستہ ای" یہ اسباب، حد اسباب، بیرون اسباب اور ان سے آگے نکلنا بھی عجیب معاملہ ہے۔ اسباب کے پرستاروں کو کیا معلوم کہ یہ سب کیا تانا بانا اور گورکھ دھندا ہے۔ "کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور"۔

خدائے پاک ان کو غریق رحمت کرے اور اپنے قرب میں ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے۔ ہمارے شیخ کو ان صفات میں کیا مقام حاصل تھا، وہ تو معلوم کرنا ناممکن ہے مگر یہ امر ہمارے ہاں معروف ہے کہ جس پر ان کی نگاہ کرم پڑی، اس کو حسب مقدور اس لازوال راز کی لذتوں سے آگاہ کر دیا۔ ان کی خدمت میں رہنے والے گدڑی پوشوں اور ٹوٹے پھوٹے لوگوں کی نگاہ میں کوئی بھی بڑے سے بڑا حاکم یا عہدہ دار کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ آج تو فقر و درویشی کا معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ کس کے ہاں کون بڑا افسر جاتا ہے۔ مگر وہاں ہم نے بالکل اس کے برعکس دیکھا۔ ایسے افسروں اور بڑے لوگوں کی تعداد کم نہ ہوگی جو متعدد بار چکر کاٹ کاٹ کر بالآخر تنگ آ گئے اور آنا بند کر دیا کیونکہ ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہمارے ملک کے دو بڑے "دبنگ" گورنر نشتر مرحوم اور میاں امین الدین بہت کوشش کے باوجود شرف ملاقات سے محروم رہے، لیکن میرے جیسے دہقانی پر ان کی نظر عنایت رہی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ "این سعادت بزور بازو نیست۔

ایسے واقعات کوئی ایک دو نہیں ہیں کہ میں سب گنوا ڈالوں اور ان سے یہ معلوم ہو کہ اسباب کے بارے میں میرا معاملہ کیا ہے؟ اگر اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات پاک اپنے اور اپنے نبیوں کے ماننے والوں کے ساتھ کوئی خاص امتیازی سلوک نہ فرمائیں، تو میں کہہ نہیں سکتا کہ سب کا کیا حال ہو مگر میرے جیسے کمزور انسانوں کے ایمان کا قائم رہنا محل نظر ہو جائے۔ یہی امتیازی سلوک اس کی وہ علامات اور نشانیاں بھی ہیں

Marfat.com

جس کو وہ اپنے بندوں کو ان کے نفوس کے اندر اور ان کے معاملات میں باہر بھی دکھاتا رہتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قوی ایمان کس کا ہو گا مگر انہیں بھی اطمینان قلب کیلئے نشانی و علامت کی ضرورت پیش آئی۔ ایمان کے ایک دوسرے بڑے مظہر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ "میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا" یہ سنت خداوندی ہر زمانے میں قائم رہے گی جب تک اس کو ماننے والے باقی رہیں گے۔ وھو ولی التوفیق

عنایات خداوندی

خدا کی ذات پاک چونکہ لامحدود ہے' اس لئے ظاہر ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ان کا معاملہ بھی اتنا ہی وسیع اور تنوع والا ہو گا۔ میرے ساتھ جو ہوتا ہے اس کی میں ایک دو مثالیں ہی دوں گا تاکہ یہ اسباب اور اسباب سے باہر والی بات بھی کچھ سمجھ میں آ سکے۔ واقعات بیان کرنے اسلئے ضروری ہیں کہ انسانی دنیا میں اسکے بغیر بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ یوں تو خود جہاد آزادی کے آغاز' اس کے دوران اور اس کے بعد کے ساتھ تعلق رکھنے والے متعدد واقعات ہیں جن کو بیان کیا جائے تو وہ ایمان و یقین کی تقویت کا باعث ثابت ہوں' مگر یہاں اس تفصیل کی تو گنجائش نہیں ہے۔

سورۃ الطلاق کی وہ آیت مبارک کہ...... "وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" (وہ (اللہ تعالیٰ) ان کا انتظام و بندوبست ایسے طریقہ یا مقام سے کرتے ہیں کہ جہاں ان کا (یعنی بندوں کا) گمان بھی نہیں پہنچ سکتا' ایک عجیب و غریب خوشخبری ہے اور خصوصی معاملہ ہے اس خالق حقیقی کا اپنے کمزور بندوں کیساتھ ایسا نہ ہوتا تو ہم جیسے لوگوں کا ایمان پر قائم رہنا خدا جانے کس طرح ممکن ہوتا اور جو ظاہری اور موجودہ "خدا" ہیں' ان سے بچ نکلنے کا کیا راستہ ہوتا۔ روپیہ پیسہ' مرتبہ' زمین' مکان' کاروبار غرضیکہ کتنے خدا ہیں جن کی پوجا میں ہر خاص و عام روز و شب مشغول ہے۔

مجھے اپنی مادی بے سروسامانی پر خوشی اس لئے بھی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو محض بد بختی ہو گی' جبکہ یہ ہے بھی اسی ذات حق کی جانب سے کہ یہی بے سروسامانی میرے لئے اس کے کرم کا باعث بن گئی شاید اس لئے کہ "شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں" خدا نہ کرے کہ ایسی بد بختی میرے حصہ میں ہو کہ میں اس کی ان سب عنایات کی ناشکری کروں۔ تو پھر اس وعید "وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ" سے کون بچا سکتا ہے اس کی ذات پاک کے بغیر۔ "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" کا ایک عجیب واقعہ دیکھئے...... جن دنوں چندریگر وزیر اعظم تھے' مجھے ہمارے قائد رئیس الاحرار چودھری غلام عباس مرحوم نے فرمایا کہ میں کراچی جاؤں۔ ایک کام بتایا۔ میری مالی حالت ایسی تھی کہ میں سیٹلائٹ ٹاؤن کے دوسرے گوشے سے پیدل چل کر سول لائن صدر میں چودھری صاحب کے پاس روزانہ آتا جاتا تھا۔ چار آٹھ آنے بس کا کرایہ ہو گا مگر وہ بھی اکثر پاس نہ ہوتا۔ تحریک آزادی اور الحاق ہم لوگ تقریباً

Marfat.com

اسی سامان کے ساتھ چلاتے رہے ہیں۔ مشکل سے لاہور تک کا کرایہ مہیا کیا۔ لاہور جانے کا بظاہر کوئی مقصد نہ تھا۔ آج سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ محض بدحواسی میں یا پھر کسی غیبی داعیہ کی بنا پر لاہور کا قصد کیا۔ وہاں دہلی مسلم ہوٹل کے ایک شریک سردار محمد عالم خان ہماری جماعت کے مقامی صدر تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارا مرکز رہا ہے۔ میں وہیں ٹھہرا۔ انہوں نے جب مجھے خلاف معمول ایک دو دن بیکار بیٹھے دیکھا تو پوچھا کہ میں کیوں وہاں گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بتایا کہ میرا لاہور میں کوئی کام نہیں ہے۔ میں کراچی جا رہا ہوں۔ پوچھا "کب جاؤ گے؟" تو میں نے کہا "بس جلدی جا رہا ہوں"۔ بات ختم ہو گئی۔ وہ جب شام کو پھر میرے کمرے میں آئے تو اپنی سابقہ روایت اور پختہ عادت کے خلاف (ان سے معذرت کے ساتھ) کراچی کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ مجھے دیا۔

کراچی جانے کے بارے میں میری مشکل صرف اسی قدر نہیں تھی۔ آنے جانے کا کرایہ، رہائش کا خرچ اور اس سے بھی بڑھ کر وہاں نقل و حرکت کی ضروریات۔ ان سب سے بڑھ کر ایک مشکل یہ تھی کہ میں نے ان ہی دنوں میں تازہ تازہ ایک "چلّہ" یا طویل اعتکاف کیا تھا، جس کی وجہ سے طبیعت میں ایک خاص لطافت تھی۔ خاص کر کھانے پینے میں بہت شدّت کے ساتھ احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ ہوٹل کا کھانا تو محض خارج از بحث تھا، قیام بھی مشکل تھا، مگر کھانا تو ناممکن۔ کراچی میں نہ تو ایسی کوئی واقفیت تھی، نہ کوئی ایسا عزیز کہ جس کے پاس ٹھہرا جائے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی ہوٹل میں رہ کر اپنا کوئی علیحدہ انتظام کرنا میرے لئے اور بھی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ایک عزیز کا خیال آیا جو کوئی سال دو سال قبل کراچی میں تھا۔ سوچا کہ اگر وہ مل جائے تو وہ صحیح شخص ہے۔ مگر ساتھ ہی احساس ہوا کہ اولاً تو اس کا وہاں ہونا نہ ہونا بھی معلوم نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر، اس کا کوئی پتہ ٹھکانہ بھی تو معلوم نہ تھا جب اس طرح سب طرف سے مایوسی ہوئی تو سورۃ الطلاق والی آیت مبارکہ یاد آئی اور سوچا "پروردگار! دیکھتے ہیں کہ آپ کیسے یہ بندوبست فرماتے ہیں"۔ کراچی کے ہوائی اڈہ سے باہر آیا تو دیکھتا ہوں کہ وہی میرے عزیز محمد افضل خان سامنے سے آ رہے ہیں۔ ملے تو حیران ہو گئے کہ میں اچانک کیسے آ گیا۔ ان سے پوچھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں تو انہوں نے جیب سے ریل گاڑی کا پنڈی کا ٹکٹ نکالا اور کہا ....

"میں تو راولپنڈی جا رہا تھا۔ ریل گاڑی چند گھنٹے لیٹ تھی۔ بلا ارادہ ہوائی اڈہ کی طرف چلا آیا۔"

"میں نے دل میں کہا ارادہ تو بس اسی ایک کا ہے۔ ان سے کہا "پہلے چلو کسی ہوٹل میں، پھر جا کر ٹکٹ واپس کر دو" جب ہم ہوٹل پہنچے تو لفٹ پر کام کرنے والے سے لے کر تمام کارکن ہمارے علاقہ سے تعلق رکھنے والے نکلے۔ سب ایک ایک کر کے ملے۔ خانساماں نہ صرف مجھے جانتا ہی تھا بلکہ میری اس مجبوری سے بھی واقف تھا، برتن تک نئے لایا اور خود جا کر سبزی وغیرہ جو کچھ ہوتا وہ خرید لاتا اور میرے لئے علیحدہ پکاتا رہا۔ بتایئے میں اگر چاہتا کہ خود ایسا انتظام کروں تو یہ کیسے ممکن تھا۔ مگر جس کیلئے ممکن تھا اس نے ایسے کیا کہ میرے وہم و گمان کو بھی وہاں تک رسائی نہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد اب اس کام کی بات تھی، جس کیلئے مجھے کراچی بھیجا گیا تھا۔ اس میں وزیر امور کشمیر اور چند دوسرے متعلقہ سرکاری لوگوں سے ملنا تھا۔ اس کیلئے گاڑی وغیرہ کی ضرورت کا اندازہ ہر اس شخص کو ہو گا جو کراچی آتا جاتا ہے۔ ٹیکسی کیلئے بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ دوسرے ہی دن ایک اور دوست ملنے آیا۔ ان کے ساتھ ایک طویل عرصہ پہلے جیل میں تھوڑی سی رفاقت رہی تھی، مگر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ملک میں بھی ہیں یا نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کو کیسے میرا پتہ چلا۔ وہ آئے اور اپنی ایک اعلیٰ قسم کی گاڑی، جس کی چھت علیحدہ ہونے والی تھی میرے پاس چھوڑ دی تاکہ کراچی میں مجھے سفر میں سہولت ہو، اور چلے گئے۔ اتنا پوچھا کہ میں کب تک کراچی میں ہوں۔ وہ بعد میں بھی آئے گئے اور فون پر بھی بات کرتے رہے۔ طے یہ ہوا کہ میرا کام ختم ہو تو میں دو تین دن فارغ ہو کر ان کے ساتھ رہوں، محض تفریح کے نقطہ نظر سے۔ مقررہ دن پر وہ تو آ گئے مگر میرے لئے فارغ ہونا مشکل تھا ہوٹل کا بل جو ادا کرنا تھا اس نے آتے ہی کہا کہ میں بل ادا کر آیا ہوں۔ چلو چلیں دو تین دن ان کے ساتھ رہے تو مجھے واپسی کی بھی فکر تھی۔ طبیعت پر بے حد جبر کر کے اور ایک طرح سے بے حیائی کی کہ ان کو کچھ پیسوں کیلئے کہا وہ بھی کام پر چلے گئے اور میں بھی دن کو باہر رہا۔ جب اکٹھے ہوئے تو میں نے پیسوں کا پوچھا کچھ گھبرا کر کہنے لگے "کیوں وہ آپ کو ملے نہیں؟ یہ کہہ کر مجھے ساتھ لے کر میرے والے کمرے میں آئے اور کہنے لگے "کہ پیسے تو میں اس دراز میں چھوڑ گیا تھا۔ جب دراز کھولا تو وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا سو سو اور پانچ پانچ سو کے نوٹ تھے۔ اگر لاکھ نہیں ہوں گے، تب بھی اس کے لگ بھگ ہوں گے۔ میں نے کرایہ لیا اور چلا آیا۔ میرا تو یقین ہے کہ خدائے لم یزل کے یہ آثار اور علامات اور ایمان دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کسی ایک کا دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ خدائے پاک کی ان نوازشات کا ذکر کرنا شکر نعمت بھی ہے اور اپنے نفس کو اس کی خرابیوں پر تنبیہہ کرنا بھی کہ اگر کسی کونے کھدرے میں کوئی ایسی ویسی آرزو کسی کمین گاہ میں گھات لگائے ہو تو اس کا پتہ چلے۔ مجھے اپنے اعتکاف کے دوران کلمات مبارکہ کی مدد سے ایک حد تک بار بار اپنے نفس کے اندر دیکھنے کا موقع میسر آتا رہتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ اس کی کافی خبر بھی ہو، تاہم اللہ نفس کی خرابیوں سے محفوظ رکھے۔

میں جب صدر تھا تو ایک بڑے اچھے شخص کے ساتھ دوران سفر ملاقات ہوئی۔ بعد میں انہوں نے مجھے ایک بڑی پیٹی بھر کر سیلون کی عمدہ چائے بھیجی محض میرے اور اپنے ذوق کے اطمینان کی وجہ سے۔ مگر میں اس طرح حادثتہً کسی چیز کے گھر میں آنے کے خاص پس منظر سے بہت واقف تھا۔ سوچتا رہا کہ رب العزت! اس شخص کو مجھ سے نہ کوئی کام پڑا، نہ کوئی ایسا تعلق ہے۔ یہ اتنی مقدار میں اعلیٰ قسم کی چائے کیوں جمع ہو گئی ہے۔ میں ایسی مصلحتیں کئی بار دیکھ چکا تھا ابھی ہفتہ نہ گزرا ہو گا کہ اچانک پورے ملک سے چائے ختم ہو گئی۔ اچھی تو کیا خراب چائے بھی میہانہ ہو سکتی تھی۔ اب بھی جب اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو اس خالق و مالک کا شکریہ ادا کرنے کا کوئی مناسب ڈھنگ نہیں ملتا کہ جس نے میری اتنی سی ضرورت کا بھی

Marfat.com

اتنا خیال رکھا۔ پھر وہ کون کافر ہے جو ایسی لازوال نعمتوں کی بے قدری کر کے ان کا کفران کرے اور چند کھوٹے سکوں کے عوض اپنا ضمیر، رائے کی آزادی، فکر کی آزادی اور خدا کی اس کرم نوازی کا سودا کر لے۔ پھر وہ خدا سے کیا ڈھونڈتا ہے۔ مگر میرے عزیز بھائی! وہ لوگ جن کا خدا ان کی جیب میں ہو، جن کا خدا ان کی دولت ہو، عزت ہو، مرتبہ ہو، جاگیریں ہوں، اقتدار ہو اور اس قبیل کا سامان ہو، ان کو ایمان کے اس گوشے کی لذت آفرینی کا کیا علم ہو سکتا ہے اور ہو بھی کیوں اور کیسے؟

"کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا"

اور اسی اصول کو غالباً میاں محمد علیہ الرحمۃ نے پنجابی میں کہا۔ ؎

کالی رات نہ ڈھلن والی ٹھاٹھاں تھیں دل ڈردا
کنڈیاں دے وسنیک کی جانن ساڈے حال اندر دا

اس سے کوئی فخر و مباہات مقصد نہیں۔ محض اپنی کمزوری کا بیان ہے کیونکہ اگر اس کی یہ عنایات نہ ہوں تو میں کیا اور میری بساط کیا۔ میں جب بڑے بڑے اہل علم و دانش اور اہل دین و دنیا کے احوال دیکھتا ہوں تو اللہ تبارک و تعالیٰ سے اپنی کمزوریوں اور نفس کی خرابیوں سے اور زیادہ پناہ مانگتا ہوں، اللہ مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔ مقصد یہ بھی ہے کہ جب مجھ جیسے گناہ گار شخص کے ساتھ ایسا سلوک ہے تو پھر اچھے لوگ کیوں مایوس ہوں اور اس کا ہر دم کھلا ہوا دروازہ چھوڑ کر ان کمزور اور ناقابل اعتماد دروازوں پر دستک دیتے پھریں اور انسانیت اور علم و فضل کی توہین کے مرتکب ہوں۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَان۔

رئیس الاحرار کا رتبہ، بصیرت اور تقویٰ اور چٹھہ صاحب کے سوال کا جواب

ہماری سیاست میں اس سوچ میں یقیناً میں تنہا نہیں ہوں گا۔ تاہم ہمارے مرحوم قائد رئیس الاحرار چودھری صاحب مرحوم کی زندگی تو اس ضمن میں ایک سبق آموز اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ وہ شخص جو ریاست جموں و کشمیر میں تنہا حضرت قائداعظم" کا معتمد تھا، تحریک پاکستان کا مظہر اور ایک اعلیٰ سطح کی قومی شخصیت، پھر ان کے ساتھ جو ناروا سلوک یہاں ہوا، ہماری تاریخ شاید ہی ایسی کوئی دوسری مثال دے سکے۔ انہوں نے لاکھوں کشمیری مہاجرین کی آباد کاری کیلئے تو حتی الامکان جتن کئے مگر خود ایک مستعار مکان میں ہی رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ حکومت کی جانب سے ان پر جو "کمال عنایت و شفقت" ہوئی تھی کہ ان کو ہزار ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، جس کا آج ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور جو اس لائق بھی نہیں تھا کہ ان کے کسی خادم کو ملے، وہ بھی فیلڈ مارشل مرحوم کی حکومت نے

Marfat.com

سیاسی اختلاف رائے کی بناء پر بند فرمانے کی سعادت حاصل کی تھی۔ اسی حکومت کو یہ تاریخی اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کے دور میں اسی چودھری غلام عباس صاحب کو آزاد کشمیر کی ایک ایسی ناعاقبت اندیش کٹھ پتلی حکومت نے جو چودھری صاحب کے ایک بال کی قیمت کی بھی نہ تھی، سیاست کیلئے سات سال کیلئے نا اہل قرار دے کر نہ صرف اپنے منہ پر ابدی سیاہی ملی تھی بلکہ پوری ملت کو نادم و پشیمان کر دیا تھا۔ ان ''اہل کرم'' کی کون کون سی ''نوازشات'' کا ذکر کیا جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تاہم جب شیخ محمد عبداللہ پاکستان تشریف لانے والے تھے اور اس دوران بھی حکومت اور ہمارے مابین اختلافات بہت شدید تھے، پھر بھی جب شیخ صاحب کی آمد کی خبر آئی تو قائد ملت مرحوم نے ایوب خان صاحب مرحوم کو ایک طویل مراسلہ لکھا جس میں شیخ صاحب کی آمد کے مقاصد اور ان پر تبصرہ درج تھا۔ چودھری صاحب مرحوم کی بصیرت کا اندازہ کیجئے کہ باوجودیکہ حکومت کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ بظاہر اس کا کچھ بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ شیخ صاحب کس مشن پر آرہے ہیں، ان کے پاکیزہ وجدان نے اس تجویز کو سرفہرست رکھا جو بعد میں شیخ صاحب سچ مچ لے کر آئے تھے۔ ساتھ ہی چودھری صاحب نے اپنی مومنانہ بصیرت کی بناء پر یہ اعلان بھی کر دیا کہ ''شیخ کے ساتھ ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شیخ صاحب ہی پوری ریاست کے لیڈر ہیں اور وہی چودھری غلام عباس کے بھی لیڈر ہیں''۔ پھر پنڈی کے جلسہ عام میں شیخ صاحب کی بیگم صاحبہ کو ''خاتون کشمیر'' کا خطاب بھی دیا۔ اس میں جو بھی انسانی و اخلاقی قدریں شامل ہوں مگر یہ ایک نہایت ہی دور اندیشانہ اور باریک سیاسی حکمت عملی کا ایسا مظاہرہ تھا جس سے حب الوطنی کا بے مثال اور ناقابل فراموش مظاہرہ بھی ہو رہا تھا۔ دراصل چودھری صاحب مرحوم کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بہت بڑے محب وطن تھے، ان کی نسبت سے یہ بات بھی کم تر درجے کی معلوم ہوتی ہے۔ چودھری صاحب اور حب الوطنی ایک ہی شے کے دو نام معلوم ہوتے ہیں۔ وہ حب الوطنی کے پیکر ہونے کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بھی غمازی کرتے تھے کہ اَلْمُؤْمِنُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ

اس واقعہ پر فیلڈ مارشل مرحوم کو بھی اپنی سوچ کے بارے میں دوبارہ غور کرنا پڑا۔ چنانچہ پہلی بات جو انہوں نے کی، وہ خاموشی سے بند شدہ وظیفہ کی بحالی اور تمام بقایا رقم کی ادائیگی کا حکم تھا۔ یہ وظیفہ نہ معلوم کتنے سال سے بند تھا لیکن اس کی رقم تقریباً ۸۰ ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ ابھی بحالی کا کسی کو علم نہیں تھا کہ ایک روز اس وقت کے متعلقہ جوائنٹ سیکرٹری مرحوم امان اللہ خان نیازی اچانک آ گئے اور قائد مرحوم سے کہنے لگے ''مجھے آپ سے علیحدگی میں بات کرنا ہے'' وہیں ایک طرف ہو گئے مگر چودھری صاحب نے فوراً ان سے کہا ''نیازی صاحب اپنا ہاتھ جیب سے مت نکالیں'' یہ کہہ کر دونوں واپس آ گئے۔ نیازی ان کی زبان سمجھتا تھا۔ چودھری صاحب نے اس پیسہ کو ہاتھ تک نہ لگایا اور زندگی کے وہ چند آخری سال کسمپرسی میں گزارے، اس کا علم اللہ کو ہے اور کچھ ہم لوگوں کو جو ان کے قریب تھے۔ وہ چونکہ ذکر نیم شبی اور

Marfat.com

مراقبے کے سختی سے پابند تھے' غالباً اسی لئے ان کی زندگی اس شعر کے مصداق تھی۔ ؎

یہ ذکر نیم شبی' یہ مراقبے' یہ سرور
تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

ان کی زندگی کے حالات بہرحال ایک علیحدہ کتاب کا تقاضا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک سے زیادہ کا۔ ہماری صفوں میں کچھ انہی پر موقوف نہیں' ہمارے ایک اور صحافی سیاست دان جناب اللہ رکھا ساغر صاحب ہیں' جو بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ ان کو جب یہ محسوس ہوا کہ تحریک پاکستان خود پاکستان میں ہی ایک جرم سمجھی جارہی ہے اور واپس جموں جانا ناممکن ہے اور یہ کہ مہاجرت کی زندگی میں سیاست کا وہ انداز اب نہیں چل سکتا اور اپنی عزت نفس اور خودداری کو قائم رکھ کر کار سیاست لاحاصل ہو گیا ہے تو انہوں نے کاغذ کا کاروبار پوری سنجیدگی اور مسلمہ دیانت کے اصولوں پر اختیار کر کے وقت کے ساتھ مفاہمت کر لی۔ وہ اگرچہ ہمارے نقطۂ نظر اور قومی مفادات کے لحاظ سے پسپائی کی ایک مثال تو ہے مگر وہ اپنے لئے اس کی وہ توجیہہ کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ میں ایمان بچانے والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔ ساغر صاحب بھی اپنی بھیڑ بکریاں (کاغذ) لے کر کاروبار کے جنگل و بیاباں میں چلے گئے ہیں۔ بہرحال ہماری قومی زندگی کی مختلف سطحوں پر ایسی کئی قابل تقلید اور ایمان افروز مثالیں ملیں گی۔ جناب ساغر کا ذکر اس لئے کیا کہ ساغر صاحب اپنی اعلیٰ سوچ' باریک بینی اور سیاسی مسائل کی تفہیم میں متحدہ ہندوستان میں صف اول کے لوگوں میں شمار ہو سکتے ہیں اور اگر عزت نفس کا سودا کر لیتے تو وہ کئی بار آزاد کشمیر کے صدر رہ چکے ہوتے یا بیٹھے بٹھائے لکھ پتی تو ضرور ہو جاتے۔ یہ پیسہ تو کسی گنتی میں نہ ہوتا۔ جناب چٹھہ صاحب محترم سے گزارش ہے کہ مزید اطمینان کیلئے اگر ہو سکے تو وہ کچھ زحمت کر کے مشکوٰۃ شریف کے صفحہ ۷۵۹ جلد دوم پر درج دو تین متعلقہ احادیث مبارکہ ضرور دیکھ لیں۔

اسی طرح ہماری قومی بدنصیبی یہ بھی ہے کہ ہمارے کئی بڑے مخلص' ذہین اور جفاکش نظریاتی کارکن ان آزمائشوں کی تاب نہ لا سکے۔ اپنے ماضی سے وہ یکسر بے گانہ ہو گئے۔ نہ وہ خیالات رہے' نہ عقیدہ' نہ عزائم' نہ شوق وولولہ' نہ وہ ذوق جہاد' کچھ بھی نہ رہا۔ محض لاشے ہو کر رہ گئے۔ میں ان کو دیکھتا ہوں' ان کے کارناموں کو یاد کرتا ہوں' ان کی قربانیوں کا شمار کرتا ہوں تو وہ لوگ تاریخ ساز شخصیات معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب ان کا حال دیکھتا ہوں تو عجب سا لگتا ہے۔ وہ لوگ جن سے شیر بھی ڈرتے تھے' اب وہ خود بھیڑوں سے ڈرتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ وہ اپنی ایسی حقیر امیدوں اور آرزوؤں کا شکار ہو گئے ہیں جو ان سے بہت کمتر درجے والوں کے بھی شایان شان نہ تھیں۔ پھر وائے ناکامی کہ اکثر کی وہ موہوم اور رذیل امیدیں بھی حسرت ہی بن کر رہ گئیں۔ یہ ہونا بھی چاہئے۔ جب کوئی صاحب عقیدہ شخص اپنی قیمت مقرر کر لے اور ذہنی طور پر بکاؤ مال ہو جائے تو پھر اسے اپنی ضمیر کے نہیں بلکہ منڈی کے بھاؤ

Marfat.com

کے ماتحت گزر کرنا ہوگی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔

شکر نعمت

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم کے سایہ میں رکھے اور اپنی آزمائشوں اور غضب سے بچائے۔ میں جب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو اس طرح آزمائے گئے اور اپنے بارے میں سوچتا ہوں کہ کہیں خدانخواستہ مجھ پر بھی یہ افتاد پڑ جاتی تو کیا صورت ہوتی، تو پروردگار عالم کے حضور سجدہ شکر بجالانے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ انسان کی یہ موت اس کی طبعی موت سے لاکھ، کروڑ درجہ سنگین اور تباہ کن ہے۔ خدائے پاک اپنے کرم سے ہی بچاتا ہے جن کو بچاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہے وہ سردار عبدالقیوم جس نے اپنے ضمیر، آزادی فکر اور اپنی قومی کاوشوں کو اس طرح کسی حکومت کے ہاتھوں بیچ ڈالا، معاذ اللہ معاذ اللہ، تو تاریخ اس کا کیا جواب دے گی کہ آیا یہ وہی شخص ہے یا وہ مر گیا تھا اور یہ کوئی اور ہے۔ وہ شخص جس نے ڈوگرہ راج کی صد سالہ غلامی کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ایسی حالت میں کہ نہ کوئی امداد ہے، نہ مشورہ ہے، نہ کسی قسم کا کوئی ساز و سامان بلکہ خود اسی دشمن حکومت کی فوج سے ہی اسلحہ چھین کر جہاد کا آغاز کیا۔ پھر اسی طرح پندرہ ماہ تک مسلسل اسی فوج کے خلاف کامیابی سے لڑا، جو فوج اپنی بہادری میں دنیا کی اعلیٰ ترین فوجوں میں شمار ہوتی تھی۔ وہ شخص جس کے نام سے محاذ پر دشمن کی فوج سراسیمہ ہو جاتی تھی، وہ تحریک آزادی جس کی مثال صدیوں میں نہیں دی جا سکتی۔ اس کا ایک کمانڈر اس کو چلانے والا، اپنے نظریات و عقائد کا ایک ہمالیہ، صدارتوں اور وزارتوں کو ٹھکرانے والا، کیا یہ وہی شخص ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہی بکاؤ مال تھے وہ لوگ، تو کون یقین کرے گا۔ مگر تاریخ انسانی کردار کے اس قسم کے تغیر سے خالی بھی نہیں ہے۔ اس کی کوئی عقلی توجیہ مہیا کرنا مشکل ہے۔

انسانی فطرت کی نیرنگی اور اس کی توجیہ

خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو قائداعظمؒ کی طرح اپنی تحریک کے عین عروج میں یا اس کی عین تکمیل کے وقت دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کو بعد میں اپنے خود غرض اور بے عقیدہ ساتھیوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونا کیا بلکہ ذبح ہونا پڑتا ہے، نہ وہ اپنی ذاتی اور بشری آزمائشوں کی بھینٹ چڑھ کر پوری انسانی تاریخ کیلئے سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔ قائداعظمؒ کا نام اس لئے لیا کہ وہ بہت قریب کا وقت ہے۔ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی اکثر لوگوں نے نظریں پھیرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ واقعہ کون فراموش کر سکتا ہے کہ قائداعظمؒ نے حکم دیا کہ فوج کشمیر کی طرف مارچ کرے تو ہمارے انگریز کمانڈر انچیف نے

Marfat.com

انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے نوخیز اور جذبہ و شوق سے لبریز پاکستان کی پوری کابینہ نے قائدؒ کے مقابلہ میں اس انگریز کا ساتھ دیا۔ قائد اعظمؒ اگر کچھ دیر اور زندہ رہتے تو کچھ معلوم نہیں تاریخ کا یہ بے رحم اور سفاک طرز عمل ان کو کیا روز بد دکھاتا۔ آج ۲۴ اکتوبر ہے آزادی کشمیر کا یوم تاسیس۔ عین اس موقع پر آزاد کشمیر کے بانی صدر سردار محمد ابراہیم خان، اس جہاد آزادی کے ایک اعلیٰ کمانڈر سردار عبدالقیوم، اسی تحریک کے ایک اور مجاہد لیڈر چودھری نور حسین اور ان لوگوں کے رفقاء کو اسی سرزمین پر قید و بند میں رکھا ہوا ہے۔ ان کو رکھا بھی دارالحکومت میں ہے تاکہ وہ آزادی کی تقریبات کے ماتم بچشم خود تماشا کر سکیں۔ (یہ طویل مضمون میں نے چند دن قبل شروع کیا تھا۔ اس کو دہرانے کے دوران جب میں اس حصے پر پہنچا تو اس وقت آزادی کی تقریبات یعنی ۲۴ اکتوبر کا دن تھا)۔

اسی طرح اگر اور باتوں کے علاوہ کل اس کا ذکر کیا جائے کہ ایک شخص نے اپنے دور صدارت میں آزاد کشمیر میں جو بے مثال اصلاحات کیں، جن میں اسلامی قوانین کو رائج کرنا بھی شامل ہے، مگر وہ آدمی تو ایسا بے ضمیر بکاؤ مال تھا، تو بتایئے کیا جواب ہے اس منطق کا؟ اور پھر یہ کہ کیا یہی ہیں وہ لوگ جو کشمیر میں تحریک پاکستان کے علمبردار ہیں؟ دنیا کی کون سی تحریک بے ضمیر اور بکاؤ مال کے ذریعہ چلی ہے؟۔

نیرنگیٔ کردار، منزلیں پانے سے پہلے اور انہیں پانے کے بعد

میں نے تھوڑی دیر پہلے انسانی کردار کی اس عجیب و غریب تبدیلی کا ذکر کیا ہے یعنی وہی لوگ جو ایک وقت میں بے حد اہم کارنامے سرانجام دیتے ہیں، وہی دوسرے لمحے نکمّے ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں کوئی ایک مثال نہیں بلکہ تاریخ میں بڑے عظیم واقعات ملتے ہیں، خود ہماری اپنی تحریک پاکستان اور اس کے اکثر و بیشتر کارکن بھی اس کی زندہ مثال ہیں۔ اس سے بھی قریب تر ہماری حالیہ ''قومی اتحاد'' کی تحریک ہے۔ اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

میں جب تحریک پاکستان کو دیکھتا ہوں ایک طرف اس کے مقاصد، اس کے لئے جدوجہد، اس کے راستے کی مشکلات اور مخالفت اور ان کی عالمی قوت، اس کے لئے دی جانے والی بے شمار قربانیاں، وہ جذبۂ شوق، اس کی قیادت، اس کے کارکن اور دوسری طرف پاکستان بن جانے کے بعد انہی کارکنوں کے حالات، تو مجھے تو اس میں کوئی تال میل دکھائی نہیں دیتا۔ یوں لگتا ہے گویا یہ وہ کارکن نہیں تھے یا وہ تحریک یہ نہیں تھی۔ اس مقدس تحریک کی نسبت سے کوئی ادنیٰ سی بات بھی ہمارے بعد کے کردار میں دکھائی نہیں دیتی۔ نہ وہ نظم و ضبط و عقیدہ، نہ ایثار نہ اتحاد۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اس سب پر پھر ہماری عدم صلاحیت یا کھلے الفاظ میں نا اہلیت ایک اضافی ستم ہے۔ جس طرح اس تحریک کے عمل سے انکار ممکن نہیں ہے، اسی طرح ہم بعد کے جمود، بے حسی بلکہ لاتعلقی کے طرز عمل سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس کی کوئی ہمہ پہلو توجیہ

Marfat.com

میری سمجھ میں تو آتی نہیں ' حالانکہ میں اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کرتا رہتا ہوں۔ ہماری مثال اس فوج کی سی ہو گئی جو بڑے جذبے اور قربانی کے ساتھ آگے بڑھ کر اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن سے مورچہ تو چھین لے مگر اسی دن اس پر دشمن دوبارہ قبضہ کر لے بلکہ وہ فاتح فوج خود ہی اس کو دشمن کے حوالے کر دے۔ وہ محض اس لئے کہ مورچے فتح کرنے کا فن اور اس کے تقاضے دوسرے ہیں اور اس کو قابو میں رکھنے کے تقاضے دوسرے۔ پہلے مقصد کے لئے تو فوج کی بہادری ' جانبازی اور ضروری صلاحیت ہی کافی ہے مگر دوسرے امر کے لئے کئی دوسری باتوں کی بھی ضرورت ہے۔ اس مورچے کی اہمیت اور افادیت کا علم اور تدبّر و انتظامی صلاحیت کے بغیر اس کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ مثال تو ایک حد تک تشفی کرتی ہے مگر پوری بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ طریق کار ہماری پوری قومی زندگی کا مزاج اور شعار بن گیا ہے۔ پاکستان کی تحریک کے علاوہ مسجد شہید گنج کا واقعہ بھی اس مزاج پر آج تک ماتم کر رہا ہے۔ مسجد حاصل کرنے میں تو کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا گیا مگر کسی ایک نمازی نے بھی وہاں جا کر نماز نہ پڑھی بلکہ اس کو کبھی صاف تک نہ کیا گیا۔

قدرت کی متوازی قوّت

اس کی ایک اور توجیہ میرے خیال میں زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جس طرح ہماری تاریخ زیادہ تر ہماری اپنی کردہ و ناکردہ کارروائیوں پر ہی مرتب ہوتی رہتی ہے ' عین اسی طرح دست قدرت بھی جو اسباب کا محتاج یا پابند نہیں ہے ایک زیادہ طاقتور متوازی قوّت کی طرح کارفرمائی کرتا رہتا ہے۔ ورنہ ایسے واقعات کی کوئی مادی توجیہ کما حقہ نہیں ہو سکتی۔ اس کائنات کے سینہ میں شاید یہ بھی ایک عظیم راز ہے۔ پشاور میں جب پی این اے کی ایک طرح سے آخری میٹنگ ہوئی جس میں تحریک استقلال ' جمعیت علماء پاکستان اور نیشنل عوامی پارٹی کے علاوہ باقی پارٹیاں بھی تھیں ' تو میں نے ان سے یہ عرض کیا تھا کہ "جب میں بھٹو کے خلاف تحریک کو اور پھر اس کے بعد اتحاد کے کردار کو دیکھتا ہوں تو یہ حادثہ ایسے لگتا ہے کہ جیسے خدا نے ایک ناتواں چیونٹی سے ایک ہاتھی کو مروا ڈالا ہو"۔ عوام کی اکثریت بلاشبہ ان کے ساتھ تھی۔ فوج اور انتظامیہ بھی انہی کے ساتھ ' دنیا کے اکثر چھوٹے بڑے ملک بھی ساتھ تھے اور وزیر اعظم خود بھی ذہانت میں اپنی مثال آپ تھے ' اس کے باوجود جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے۔ آخر اس کی کیا عقلی توجیہ کی جا سکتی ہے؟

کارنامۂ قدرت

میرا خیال معاً تاریخ کے اس عظیم واقعہ کی طرف جاتا ہے جس کا ذکر خود قرآن کریم نے کیا ہے۔ سورہ روم کے واقعہ میں عالم اسباب کے مورخ اب تک حیران ہیں کہ شہنشاہ روم "ہرقل" کے کردار میں

Marfat.com

یکایک یہ جو تبدیلی آئی کہ ایک ایسا ست و ناکارہ اور روز و شب عیش و نشاط میں غرق شخص جو پوری سلطنت کو تباہ ہوتے مزے سے دیکھ رہا ہے وہی شخص ایک طرف نہ صرف اچانک چست و چالاک ' بہادر ' غیرت مند اور جری جرنیل بن جاتا ہے اور اپنی تمام کھوئی ہوئی مملکت واپس لیتا ہے بلکہ دوسری طرف ایرانیوں کے ملک کے بعض حصوں پر بھی قبضہ کر لیتا ہے، لیکن ایک بار پھر وہی شخص واپس اپنی اسی پرانی کیفیت پر لوٹ جاتا ہے۔ اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسانی قوت سے اوپر جو قوت ہے وہی دست قدرت کبھی کبھی اسباب کے خلاف اپنی کارفرمائی صادر کرتا رہتا ہے۔ جب وہ کسی قوم یا گروہ یا فرد سے کام لینا چاہتا ہے تو تمام اسباب عارضی یا مستقل طور پر ' جیسے اس کی مشیت ہو ' اس کے مطابق خود بخود ڈھل جاتے ہیں۔ اس تاریخی واقعہ کو محترم مولانا سید ابوالحسن ندوی نے نہایت بلیغ ' عالمانہ اور تاریخی بصیرت کے ساتھ بڑی شرح سے لکھا ہے۔

پاکستان کا وجود بھی میرے خیال میں اسی قسم کا ایک تاریخی عمل ہے جو اسباب کے تمام تر اندازوں اور تخمینوں کے خلاف ابھی تک خدا کے فضل و کرم سے چل بھی رہا ہے۔ خود قائداعظمؒ کا وجود بھی کون سے حسابی اندازوں کے مطابق تھا۔ شک نہیں کہ پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا اور باقی ماندہ کے اجزا بھی خدانخواستہ پریشان دکھائی دے رہے ہیں جو اگرچہ خالصتہً ہماری نااہلیت ' کوتاہیوں اور مجرمانہ غفلتوں کے سبب سے ہے ' پھر بھی پروردگار عالم نے اس ساری خرابی کے علی الرغم اسے قائم رکھا ہوا ہے۔ میں کئی سالوں سے بعض ایسے ذمہ دار حضرات سے جن کو اندرونی اور بیرونی معاملات کی خبر ہوتی ہے یہ سنتا رہا ہوں کہ بس ملک کے ختم ہونے میں اب صرف چند مہینے رہ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعض نے تو اس شکست کو ذہنی طور پر قبول کر کے فرار کے راستے بھی طے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ محض ہمارے طرز عمل کی بناء پر ہی اگر فیصلہ کرنا ہوتا تو یہ ملک خدانخواستہ و خدانہ کردہ کب کا دشمنوں کا تر نوالہ بن چکا ہوتا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کیا کوئی کم سانحہ ہے۔ ہماری پوری تاریخ ملیامیٹ ہو گئی اور مستقبل ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

سیاہ سامراج کے خطرناک عزائم

ہندوستان کی آزادی کی تحریک تو تاریخ کا ایک طبعی عمل تھا مگر مشیت ایزدی کے علم میں تھا کہ اگر وہ ملک ایک رہا تو کس طرح مسلمانوں کو ایک بڑی مادی قوت کے سیاہ سامراج کا نشانہ بننا پڑے گا کیونکہ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بڑی اکثریت کی نہایت متعصب قیادت پوری شدت کے ساتھ مسلمانوں یا مسلمان قومیت کے خاتمے کے منصوبے بنا رہی تھی جس میں قتل عام سے لے کر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن ' معاشرت اور تمام اجزائے ترکیبی کو تحلیل یا شدھی کرنے کا خطرناک منصوبہ مرتب کیا جا چکا تھا بلکہ اس پر عمل شروع کر دیا گیا تھا۔ خود آزادی کے بعد کے واقعات اور اس وقت تک کے حالات کا رخ

Marfat.com

اور رفتار اس کے ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ سیکولرزم کے سب سے بڑے علمبردار گھرانے کی خاتون محترمہ مسز اندرا گاندھی نے کتنی بار ایسے ہی مخالفانہ جذبات سے بے قابو ہو کر برملا کہہ دیا کہ وہ اپنی زندگی میں مسلمان قومیت کا خاتمہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ اکھنڈ بھارت کا منصوبہ اور مشرقی پاکستان پر حملہ اور اس کا توڑنا عین اسی حکمت عملی کے مطابق کارروائی تھی۔ وہ الفاظ جو سقوط ڈھاکہ کے وقت اندرا گاندھی نے کہے وہ کیسے فراموش کئے جا سکتے ہیں۔ جس طرح یزید لعنت اللہ علیہ نے سیدنا حسینؓ کا سر مبارک دیکھ کر کہا تھا کہ "آج فتح مکہ کا بدلہ لے لیا ہے" اسی طرح اس عورت نے بھی کہا "آج دو قومی نظریہ بحر ہند میں غرق کر دیا گیا ہے"۔

معجزے کا ظہور

اگرچہ مسلمانوں کی کوئی بھی قیادت ہندوؤں کے ان عزائم سے نہ تو پوری طرح باخبر تھی نہ اس پر یقین رکھتی تھی بلکہ بعض تو اس کو محض احمقانہ خیال سمجھتے تھے لیکن ایسے میں اس خیال کے بالکل برعکس ایک مثبت مقصد کے لئے خداوند عالم نے کچھ مسلمانوں کے دل میں ایک داعیہ پیدا کر دیا۔ خود قائداعظمؒ کا اس کی قیادت کے لئے انتخاب ہی اس امر کی بہت شافی دلیل ہے۔ جو مسلمان زعما اور قائدین ہندوؤں پر اس قدر "بدگمانی" نہیں کرنا چاہتے تھے، آزادی والی رات سے ہی ان کو بھی معلوم ہونے لگا تھا کہ اصل بات کیا ہے۔ میں نے حسن اتفاق سے خود مولانا حسرت موہانی مرحوم و مغفور سے جب وہ ۱۹۴۸ء میں کراچی تشریف لائے تھے ان کے سامنے بیٹھ کر وہ دلخراش اور ناقابل توجیہ روئیداد سنی ہے کہ مسلمانوں پر کیا بیتی اور کیا بیت رہی ہے۔

پروردگار عالم نے اپنی خاص مشیت سے سیاہ سامراج کے پاکستان کے خلاف ان ناپاک منصوبہ کے توڑ کے لئے ان کے دروازے پر براہ راست اسلام کے نام پر ہی ایک مملکت قائم کر دی اگرچہ بدنصیبی سے اس مملکت پر قبضہ ان لوگوں نے کر لیا جن کو ان عوامل کے ساتھ کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ انہوں نے غنیمت سمجھا کہ وہ ہندو کے ساتھ مقابلہ و مسابقت کی مشقت سے بچ گئے اور یہ ملک گویا ایک مال غنیمت تھا جس کے صرف وہی مستحق تھے۔ بے چارہ اسلام اور مسلمان دونوں صبر سے ہی کام لیں تو اچھا ہے سردست۔

طبعی اور خصوصی واقعات کا تناسب اگرچہ اول الذکر کے حق میں ہے لیکن دوسرے پہلو کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ طبعی واقعات کا تعداد اور حجم ——— میں زیادہ ہونا بھی ایک طبعی امر ہے۔ تاہم خصوصی واقعات کی صلاحیت اور استعداد و قابلیت (Quality) کا اثر و نفوذ بھی بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح جس طرح کہ خدا پر کامل یقین رکھنے والا ایک مرد مومن لاکھوں خدا کے منکرین اور بے عقیدہ

Marfat.com

انسانوں پر بھاری ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ قیامت کے برپا ہونے میں بھی حائل ہے۔ ان واقعات کی مثال بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔

بنگلہ دیش — شر میں خیر کا پہلو

مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا اگرچہ بادی النّظر میں ایک بڑا تاریخی المیہ ہے، ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خاص کر مسلمان قومیت کے نقطۂ نظر سے اور پاکستان کے نظریئے اور اس تحریک کی شکست و ریخت کے نقطہ نگاہ سے، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہی لازوال سنت خداوندی اس کارروائی کے نتیجہ کو بالکل اس کے برعکس نہ کر سکے۔ کچھ عجب نہیں کہ طول مدت میں بالآخر یہ ثابت ہو کہ بھارت کی متعصب ہندو قیادت نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارا۔ جس کو وہ اپنی تاریخ کا ایک انمٹ اور عظیم کارنامہ قرار دے کر فخر کر رہی تھی، وہ نہ صرف اس کی محض خوش فہمی تھی بلکہ اس سے جان و مال کا جو نقصان ہوا وہ خود اس کی تباہی کا سبب ہو گا اور کیا عجب کہ وہ حادثہ جو مسلمان قومیت کی کمزوری یا تباہی یا خاتمے کا تاثر دے رہا تھا وہی اس قومیت کے ابھرنے کی علامت بن جائے۔

یہ امر تو بہرحال روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جہاں بھارتی قیادت نے اپنے ہمدردوں سمیت ایک ربع صدی کی پوری ذہنی، فکری اور مادی طاقت کے صرف پر یہ کامیابی حاصل کی کہ اپنے دروازے پر قائم ایک مملکت کو جو اسلام کے احیاء اور مسلمان قومیت کی قوت کا مظہر بن رہی تھی دولخت تو کر دیا مگر وہیں یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ اسی عمل کے نتیجہ میں اسی بھارت کے ایک کے بجائے دو دروازوں پر اسی کی اپنی قوت کے صرف سے ایک کے بجائے دو مسلم ریاستیں قائم ہو گئیں اور اس طرح مسلمانوں کی قوّت میں کمی یا کمزوری واقع ہونے کی بجائے ایک طرح سے اضافہ کا سامان مہیا ہو گیا۔ بلکہ میں نے اس المیہ کے دوران بھی کہا تھا کہ اس سے بقیہ پاکستان کی فوجی قوّت یعنی دفاعی صلاحیّت میں کمی نہیں بلکہ ایک طرح سے خود بخود اضافہ ہو گیا ہے، جو ظاہر ہے کہ کسی صورت میں بھارتی قیادت کا مقصود نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم اگر خود نالائق اور اس نعمت غیر مترقبہ کے نااہل ثابت نہ ہوں تو اس سے ایک پوری تاریخ بدل سکتی ہے اور وہ غیر معمولی فطری عمل جو پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی شکل میں واضح ہوا تھا اس کی تکمیل میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے اپنی مشیت کی برتری کی قوّت سے اس پوری بساط کو خود بھارت پر ہی الٹ دیا ہے۔ بھارتی لیڈروں کی فراست، ذہانت اور ان کے حجم اور ساز و سامان کی قوّت نے ان کو خود ان ہی کی سازشوں کے جال میں گرفتار کر لیا ہے۔ پاکستان کو ناکام بنانے کی غرض سے جو پہلی سازش کشمیر پر قبضہ کی صورت میں کی گئی تھی بھارت کو خود اسی میں گرفتار کر لیا گیا اور اسی طرح دوسری بار مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر بھی وہی ہوا۔

Marfat.com

پاکستان کو ذہنی طور پر قبول نہ کر کے بھارت کی متعصب ہندو قیادت نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے اور آسان چیلنج سے بڑے اور مشکل چیلنج میں پھنسالیا ہے۔ مسلمانوں کی تحلیل اور پاکستان اور اسلام کے خاتمے کا خواب اور منصوبہ مطلوبہ نتائج کے عین علی الرغم صورت اختیار کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت نہ تو زیادہ عجیب ہے نہ مشکل اور نہ کیس زیادہ دبیز آہنی پردے میں پوشیدہ۔ جب مشرقی پاکستان کے المیہ پر چینی مدبر چو این لائی نے کہا تھا "بھارت نے خود اپنی تباہی کا آغاز کر لیا ہے" تو عین ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں بھی یہی تاریخی حقیقت ہو۔ سحر تو ان شاءاللہ ضرور ہوگی اگرچہ صد ہزار انجم کے خون سے ہی کیوں نہ ہو۔

مشرقی پاکستان کا نعم البدل

پروردگار عالم نے اگر کسی ایک یا دو مقامات پر خالصتاً مادی اسباب کو برتری کا موقع بخشا تو اس کا ازالہ بھی کسی اور طریقہ سے کسی دوسری جگہ کر دیا۔ میں تو منتظر ہوں کہ مشرقی پاکستان کا نعم البدل کب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے کئی آثار و علامات تو دیر سے دُھندلے ہی سہی مگر دکھائی دے رہے ہیں۔ واللہ اعلم۔ خدائے تعالیٰ کے مقدّس اور قادر مطلق وجود کا یہ ایک انتہائی اہم پہلو ہے ورنہ یہ دنیا آج تک کب کی اور کتنی بار اپنے مادی انجام کو پہنچ چکی ہوتی۔ تاریخ کے اس دلدوز واقعہ پر جب غور کرتا ہوں تو جہاں وحشت ہوتی ہے وہاں ایک گوشۂ اطمینان بھی ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ مشیت ایزدی کے اسی خفیہ ہاتھ نے بھارت کی اس ناپاک سازش کی بساط نہ صرف ان پر الٹ دی بلکہ بھارت کے ایک کے بجائے دو دروازوں پر طاقتور مسلم ریاستیں قائم کر دیں۔ محض قومی نقطۂ نظر سے ہی اگر دیکھیں تو جب مشرقی پاکستان تھا تو بھارت کو غالباً تین ڈویژن فوج رکھنا پڑتی تھی لیکن اب جب کہ بنگلہ دیش ہے تو بھارت کو وہاں اس ملک کی فوج کے تناسب سے فوج رکھنا ہوتی ہے جو اب غالباً آٹھ ڈویژن کے قریب ہے اور ابھی اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ گویا بھارت کے فوجی اخراجات میں اپنی حماقت کی وجہ سے کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور ابھی ہوتا رہے گا اس کے علاوہ بھی دیکھیں کہ بھارت کی حکمران مسز گاندھی نے کہا کہ اس نے دو قومی نظریہ بحر ہند میں غرق کر دیا ہے۔ بظاہر تو اس وقت یہی کچھ لگتا تھا مگر اب دیکھئے کہ اندرا گاندھی کی بات نہ صرف غلط تھی بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دو قومی نظریہ کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا بلکہ اس کو پختہ کر دیا گیا جو بنگالی اس جذباتی رو میں بہہ گئے تھے ان کے ایمان آج ہم سے زیادہ پختہ ہو گئے ہیں اس کے علاوہ بھی یہ دیکھئے کہ بھارت نے اتنی بڑی فوج وہاں رکھی ہوئی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا بنگلہ دیش اس قابل ہے کہ بھارت پر حملہ کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ مگر ایک ایسا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو اس حملہ سے بدرجہا زیادہ طاقتور اور مستقل نوعیت کا ہے وہ یہ کہ اگر دو قومی نظریہ نہیں رہا تو پھر بنگلہ دیش کو اپنے دوسرے طبعی اور

Marfat.com

جغرافیائی حصہ بنگال سے کیسے دور رکھا جا سکتا ہے؟ یہ ہے وہ دائمی خطرہ جو اندرا گاندھی نے پاکستان کو توڑنے کے جذباتی شوق میں خود بھارت کے وجود کے لئے پیدا کر دیا ہے۔ بھارت کے ہوش مند لوگوں کو اب بھی اس کارروائی پر غور کر لینا چاہئے کہ یہ مجنونانہ حرکتیں کیا ہیں؟ جب سکھوں کی طرح اس قیادت کا جنون بھی ٹھنڈا ہو گا انہیں تب معلوم ہوگا کہ انہوں نے کیا کھویا کیا پایا۔ بھارتی قیادت کا یہی طرز عمل نہ صرف ان کے لئے بلکہ پورے ایشیائی خطۂ اور پورے عالم کے امن کے لئے خطرہ کا باعث بن رہا ہے۔ اس میں اب کوئی دو رائے نہیں ہیں کہ اگر بھارتی قیادت مشرقی پاکستان کو توڑنے میں اپنا گھناؤنا کردار ادا نہ کرتی تو ان کو آنے والا روز بد کسی صورت نہ دیکھنا پڑتا، خصوصیت کے ساتھ سکھوں کا معاملہ کبھی نہ پیدا ہوتا۔

بھارتی قیادت کے عزائم، ان کی حکمت عملی اور طریق کار کے بارے میں ایک ضروری بات یاد آ گئی جو اس پورے فلسفے کی واضح غمازی کرتی ہے۔ گذشتہ دنوں راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران بی بی سی کے نمائندے نے ایک بھارتی اخبار نویس کی موجودگی میں مجھ سے یہ سوال کیا "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کے لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق کے خواہاں ہیں جب کہ بھارت میں جمہوریت ہے اور اس طرح سے مکمل آزادی ہے اور کوئی مسلم و غیر مسلم کا سوال نہیں ہے جب کہ یہاں تو لوگ جمہوریت کے لئے ابھی تحریک چلانے کی فکر میں ہیں" اس نے ساتھ ہی مثال دی "دہلی کی مرکزی سیٹ پر ووٹروں کی اکثریت مسلمان ہے لیکن نمائندہ ہندو ہوتا ہے" وہ بتانا یہ چاہتا تھا کہ وہاں اب ہندو مسلم یعنی دو قوموں کا تصوّر نہیں رہا اور مسلمان وہاں خوش ہیں۔ یہ سوال بھی اس نے غالباً بھارتی صحافی کی ایماء پر ہی کیا ہو۔ واللہ اعلم۔ میں نے کہا بلکہ یہی تو واضح دلیل ہے کہ وہاں متعصب ہندوؤں کا کتنا دباؤ ہے کہ مسلمان واضح اکثریت میں ہونے کے باوجود اپنا نمائندہ تک نہیں کھڑا کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے مسلمان پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ وہ دونوں ہی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ذوق شعری اور اس کا سیاسیات پر اثر

جہاں کہیں بھی میں نے اس تحریر میں زور پیدا کرنے کے لئے یا محض ایک کیفیت کو زیادہ بہتر طریقہ سے بیان کرنے کے لئے کسی مفکر کا قول یا شعر لکھا تو وہیں مجھے نوابزادہ نصراللہ خان صاحب محترم یاد آئے۔ کچھ اس لئے بھی یاد آئے کہ اگر شعر میں کوئی لفظ سہواً آگے پیچھے ہو گیا ہو اور وزن ٹھیک نہ رہا ہو تو جو انقباض اور تکدر ان کی طبیعت پر ہو گا اس سے ڈر لگتا ہے۔ یاد رہے کہ نوابزادہ صاحب بھی ان دنوں قید تھے گھر پر ہی سہی۔ میں علمی یا ادبی وجہ سے بہت کم مگر ان کی وجہ سے زیادہ احتیاط کرتا ہوں کہ کوئی شعر غلط نہ پڑھا جائے مگر وہ زیادہ اس وجہ سے بھی یاد آتے ہیں کہ سیاسی تقریروں میں اشعار پڑھنے کے بارے میں میری رائے اتنی ہی شدت کے ساتھ مخالف ہے جتنی اشعار پڑھنے کی حمایت میں ان کی طبیعت

Marfat.com

ہے۔ ڈر اور ادب کے باعث کبھی ان کو تو نہ کہہ سکا مگر یہ بات دل میں نہیں رہ سکتی۔ میرا بس چلتا تو کسی بھی سیاسی تقریب یا تقریر میں ان کو شعر کبھی نہ پڑھنے دیتا مگر یہ بھی معلوم ہے کہ نوابزادہ صاحب کے ذوق سخن کی حدود کیا ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو' حقہ نوشی سے لے کر خار زار سیاست تک 'اگر شعر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

عرصۂ دراز تک مجھے بہت الجھن رہی کہ محترم نوابزادہ صاحب' حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم اور چودھری محمد علی مرحوم جو فن خطابت میں ایک خاص مقام رکھتے تھے' ان کا وہ اثر کیوں نہ مرتب ہوا جو اس خطابت کا طبعی اور فطری تقاضا تھا۔ یوں تو اور بھی کئی لوگ اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ایسے لوگ ہوں گے بھی کافی مگر وہ خطابت جو محض پیشہ ورانہ ہو میرا موضوع نہیں ہے' اس کا حسن و جمال تو محض دکھاوا اور پانی کے ایک چھینٹے کا محتاج ہوتا ہے لیکن یہ جو بامقصد اور دل سے بات کرنے والے حضرات ہیں ان کا اثر تو بہرحال ہونا ہی چاہیے تھا مگر امیر شریعت کو بھی شکایت رہی کہ تقریر تو ان کی سنی جاتی ہے لیکن ووٹ مسلم لیگ کو دیا جاتا ہے۔ چودھری صاحب مرحوم اگرچہ عوامی مقرر تو نہ تھے مگر ان کی تقاریر نہایت ہی پُر مغز' دلائل اور حجت کے اعتبار سے بہت منفرد ہوتی تھیں مگر ان کا بھی کہیں کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔

ہمارے نوابزادہ صاحب تو اس فن میں ہمہ صفت موصوف ہیں لیکن اس تناسب میں اثر تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کی تقاریر کے فن' ذوق اور مواد کا تقاضا تو یہ ہے کہ نہ صرف ہماری اپنی پوری قوم بلکہ دوسرے بھی اگر ان سے رہنمائی حاصل کریں تو عین جائز ہے۔

میرا خیال ہے کہ ۱۹۶۸ء کے اپریل میں یا اسی کے قریب میں نے لاہور کے ایک اجتماع میں حضرت بخاری مرحوم کے بڑے صاحبزادے کو سنا تو میری وہ امیر شریعت والی مشکل حل ہو گئی! اسی طرح چودھری صاحب مرحوم نے جن دنوں نظام اسلام پارٹی بنائی اور پھر جن دنوں وہ فیلڈ مارشل مرحوم کے خلاف انتخابی مہم پر تھے' ان کو ایک بار پنڈی میں سنا تو وہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ نوابزادہ صاحب محترم کی کئی تقاریر سنیں مگر ان کی ایک خاص تقریر نے میری یہ مشکل حل کر دی۔ مارشل لاء کے پہلے بجٹ کے خالق غلام اسحاق خان کے اور بجٹ کے خلاف قومی اتحاد کے رہنما ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ کئی جلسے کرنے کے بعد ہم نے چکوال میں بھی اکٹھے ایک جلسہ سے خطاب کیا نوابزادہ صاحب کو میں سن رہا تھا تو محسوس کر رہا تھا کہ بے چارہ اسحاق خان اب رہے گا جا کر کہاں؟ اس کی تو نواب زادہ صاحب نے گویا چمڑی اتار دی۔ جب ان کا خطاب اور زور استدلال عین نقطۂ عروج پر پہنچا تو انہوں نے حسب عادت یا بہ مجبوریٔ ذوق شعری ایک شعر پڑھا۔ وہ کچھ ایسی جذباتی کیفیت تھی کہ اس شعر نے تو گویا کمال ہی کر دیا۔ سامعین لوٹ پوٹ ہو گئے جب میں واپس رہائش گاہ پر پہنچا تو نوابزادہ صاحب کی اس پوری اور لاجواب تقریر کا کوئی ایک لفظ بھی یاد نہیں تھا

Marfat.com

صرف وہ شعر یاد رہ گیا تھا اس طرح گویا وہ شعر اس پوری تقریر کا بدل ہو گیا۔ نہ بجٹ یاد تھا نہ اسحاق خان۔ ان دنوں اسحاق خان نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کے باوجود ہمارے خیال میں وہ عوام دشمن بجٹ پیش کر کے نہایت سادگی سے ارشاد فرمایا تھا کہ اس سے عوام تو بالکل متاثر نہیں ہوتے تو نواب زادہ صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

نہ دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
ارے تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اس طرح وہ بجٹ بھی قابل قبول ہو گیا اور اسحاق خان بھی معصوم ہو گئے۔ سامعین کا بھی یقیناً یہی حال ہوا ہو گا تو گویا اس طرح تقریر کا اثر خود ہی زائل ہو گیا یا زیادہ موزوں الفاظ میں گویا وہ شعر خود ہی پورے مقدمے کی جزا بن گیا اور بات آئی گئی ہو گئی تا ایں ہمہ نواب زادہ صاحب کی ذات پوری ملت کے لئے ایک بیش بہا عطیہ اور سرمایہ فخر ہے ان جیسا کوئی بھی تو دوسرا موجود نہیں۔ ان کی ذات ہمارے لئے ان کے ہی پڑھے ہوئے ایک شعر کے مصداق ہے اور رہے گی ؎

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

خدائے برتر ان کو خوش رکھے۔ جہاں بھی وہ ہوں (اس وقت وہ نظر بند تھے) بظاہر اس وقت تو یہ کوئی دعا نہیں معلوم ہوتی مگر فطرت کے اس تعزیری اور ظلمت کے دور میں ان کا بر کنار رہنا ہی مناسب ہے اور غالباً خدائے پاک کے اس ارشاد کے بھی مطابق جو اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ "وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا" ان جیسا مخلص شخص کسی ملک و قوم کو روز روز نصیب نہیں ہو گا اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور ان کے ذوق و شوق میں ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔ یہ تو تھی وہ مشکل جو جناب نوابزادہ صاحب کے بارے میں تھی۔ دوسرے دو بزرگوں سے متعلق کسی دوسری جگہ ان شاءاللہ ذکر کروں گا بشرط زندگی۔

فلسفہ سیاست اور اس کے حسابی قاعدے

یہ تقریر والا قصہ میں نے کیوں گوش گزار کیا۔ اس کی کچھ وضاحت بھی کر دوں۔ میرے خیال میں سیاست اپنی ہمہ گیری کے باوجود اور نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ بے حد خشک اور انتہائی پیچیدہ معاملہ ہے۔ ہمہ گیری تو ایسی ہے کہ اس کی اپنی ریاضی ہے جس میں دو ضرب دو کبھی بھی چار نہیں ہوتے بلکہ کبھی آٹھ اور کبھی دس اور کبھی تین پر آ جاتے ہیں، کبھی صفر پر۔ جس کسی نے بھی ایک سائنسدان کی طرح

Marfat.com

اس کو صاف اور واضح سمجھ کر اس میں قدم رکھا وہ کسی بھی پہلے مرحلے ہی میں ناکام ہو گیا۔ چودھری محمد علی صاحب مرحوم کی ناکامی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ وہ بنیادی طور پر ایک ماہر سائنسدان تھے۔ وہ بھی ریاضی اور مالیات کے، جہاں دو ضرب دو کو چار سے ایک بال برابر بھی زیادہ یا کم کرنا کفر مطلق اور ناقابل تصور ہے اسی طرح سیاست کا اپنا عروض قافیہ اور ردیف ہے۔ جس کا کوئی ادنیٰ سا تعلق بھی معروف صنف سخن کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی، کسی مقام پر بھی یکجا نہیں ہوتے۔ یعنی اس کے دامن میں غیر کا قطعاً کوئی گزر نہیں ہے حتیٰ کہ خود مذہب بھی کبھی کبھی اس کو تنہا چھوڑ دیتا ہے اور اکثر و بیشتر درون خانہ پردے میں رہ کر اس کی رہنمائی کرتا ہے یہی نہیں بلکہ دوسرے علوم و فنون کے تقاضے تو بسا اوقات اس کے تقاضوں سے متصادم ہونے لگتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ خود اسی کا جو اپنا فلسفہ اور سائنس ہے وہ بھی اس کے عملی پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے، ورنہ دنیا کے سب بڑے بڑے ماہرین علم سیاست اور سائنسدان ہی بڑے بڑے سیاسی زعما بھی ہوتے جب کہ پوری تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی مثال ملتی ہو یا یہ کہ تمام بڑے بڑے عابد و زاہد اور علماء دین کا ہی اس پر قبضہ و تسلط رہتا جب کہ تاریخ کی گواہی اس کے برعکس ہے۔

سیاست کاروں کا سیاست پر اثر

ایک بات تو بہرحال معلوم و معروف ہے کہ سیاست کا فلسفہ چانکیہ کا ہو، مکیاولی کا ہو یا اس کے برعکس، وہ مذہبی ہو یا لادینی ہو، اسلامی ہو یا غیر اسلامی، مشرقی ہو یا مغربی اور مادی ہو یا غیر مادی، ہر صورت میں اس کے اطلاق کا دارومدار اس فرد یا ان افراد پر ہے جو اس کو نافذ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے خود سیاست میں تنوع و تضاد بھی عین فطری عمل ہے اس پر تو میں کسی دوسرے مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا تاہم افراد کے اعتبار سے دو بنیادی گروہ تو معلوم ہیں۔ ایک وہ جو خالصتہً مادی اسباب پر ایمان رکھتا ہے اور اسی کے مطابق اپنا طرز عمل متعین کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو اسباب کو بھی ایک ذریعہ ہی سمجھتا ہے اور اعتماد صرف اسباب کے خالق پر رکھتا ہے۔ اس لئے سودے بازی تو وہ شخص کرے گا جس کا سیاست میں مقصد ہی صرف یہی مادی مفاد ہو جس طرح کہ انتخابات میں کچھ لوگ جھوٹ موٹ امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور کسی امیر امیدوار سے کچھ لے کر ان کے حق میں دستبردار ہو جاتے ہیں یہ بات زیادہ آسانی سے تعمیرات عامہ کے ٹھیکیداروں کے کام کی مثال سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اکثر لوگ ٹینڈر صرف اس لئے دیتے ہیں کہ ان کو "پول" کی رقم سے کچھ مل جائے، ورنہ اگر ان کو وہ کام مل بھی جائے تو وہ اسے کبھی نہ کریں۔ یہی حال کئی سیاست کاروں کا بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہیں تو اصل میں ہم سب اسی معاشرے کا حصہ۔ سودے بازی کی دوسری وجہ وہ "شکم" ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے سامان موت کہا ہے اور ظاہر ہے کہ "شکم" سے مراد صرف اپنا ہی شکم نہیں بلکہ بیوی، بچے، عزیز و اقارب اور

Marfat.com

ایک طرح سے ذریعہ معاش مراد ہے مگر وہ شکم ان کا نہیں جو شکم کے آقا و مالک ہیں بلکہ یہ ان کا شکم ہے جن کا آقا و مالک ہی شکم ہے۔

شیخ کامل کی تعریف

اس ضمن میں مجھے یاد آیا کہ میں ایک بار ابتدا میں اپنے شیخ کی خدمت میں بیٹھا ہوا کسی وجہ سے گھریلو ذمہ داریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رزاقیت کے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی درست فرماتے ہیں مگر ہر انسان کی کچھ بشری ذمہ داریاں بھی تو ہیں کہ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ فوراً ہی غصہ سے فرمانے لگے کہ "دیکھو جی۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز کا رازق و مالک صرف وہی ایک خدا ہے مگر بعض لوگ سوچتے ہیں، نہیں ہم بھی مالک و رزاق ہیں"۔ ان کے اس ارشاد نے میرے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ بات جو وضاحتی بیان سے سمجھ میں نہ آ رہی تھی وہ یقین میں بدل گئی اور صد ہزار الحمد للہ علیٰ ذلک کہ وہ بدستور قائم ہے۔ اسی طرح میں ایک اور بزرگ شخصیت کے پاس بیٹھا کرتا تھا ان کے پاس ایک سکول ماسٹر کا بھی کثرت سے آنا جانا اور بیٹھنا ہوتا تھا۔ وہ بزرگ اس ماسٹر صاحب سے سلطان باہو صاحب کا کلام اکثر سنتے تھے۔ یہ ماسٹر صاحب وہ حصہ ضرور پڑھتے تھے جس میں انہوں نے شیخ کامل کی تعرف میں فرمایا ہے۔

"اول غم ٹکڑے دا میٹھے وت رب نال چا ملاوے ہو"

وہ بزرگ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا میں اس شعر کا مطلب سمجھتا ہوں میں نے پہلے تو کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا مگر ان کے پوچھنے پر سوچنا شروع کیا۔ میں نے گزارش کی کہ میرا خیال ہے کہ سلطان باہو علیہ الرحمۃ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ "شیخ کامل وہ ہے جو پہل تو مرید کے دل میں استغنا کی کیفیت پیدا کرے پھر اس کو خدا کے ساتھ ملا دے" بہت خوش ہوئے اور فرمایا "لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ ماسٹر کس خیال سے پڑھتا ہے" مجھے کچھ اندازہ تو ہو گیا تھا مگر میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا ناراضگی سے فرمانے لگے "اس کا خیال یہ ہے کہ شیخ کامل وہ ہے جو پہلے تو مرید کو خوب مال و دولت مہیا کرے پھر اس کو خدا سے ملائے" ظاہر ہے کہ یہ دونوں باہم متضاد و متصادم ہیں گویا ناممکن ہیں۔

سکون و اطمینان کی دولت

میری زندگی بظاہر جیسی کچھ بھی ہے جس کو ہر شخص اپنے آپ پر قیاس کر کے اپنے معانی نکالتا ہے لیکن اس میں میرے مالک نے مجھے جو اطمینان اور لطف و عزت عطا فرمائی ہے، کسی کروڑپتی شخص پر اگر اس کا سایہ بھی پڑ جائے تو اپنی ساری دولت کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے۔ میں نے بڑے بڑے دولت مندوں کو

Marfat.com

بندگانِ خدا کے دروازوں پر عاجزوں کی طرح ایسے پڑے ہوئے دیکھا ہے جیسے غبار راہ ہوتا ہے۔ کیا دولت مند کیا بڑے بڑے سرکاری عہدہ دار۔ کئی لوگ تو ان سے ملاقات کی سعادت سے بھی محروم ہی رہے۔ یہ لوگ جس کو بڑی بات سمجھتے ہیں یعنی یہ روپیہ اور مرتبہ، ان کو اس کی اصل کا علم نہیں ہے کیونکہ بندگانِ خدا کی توجہ اور ان کے ساتھ چند لمحوں کی رفاقت، صحبت اور مجلس سے ہی یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ مجھے چونکہ ایسے حضرات کی صحبت کی سعادت حاصل رہی ہے، اس لئے مجھے اس کا کچھ نہ کچھ حال معلوم ہے۔

بے سروسامانی اور قدرت کے کرشمے

ویسے میں ان حضرات کو، جن کو غلط فہمی ہوئی ہے، حقیقت جاننے کے بارے میں زیادہ مکلّف بھی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اولاً تو ہر شخص کسی بات کو سن کر اسے اپنے آپ پر ہی قیاس کرتا ہے اور کنوئیں کے مینڈک کی طرح سمندر کا وہ کوئی تصوّر ہی نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ بعض واقعات ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان کی مثال پر کوئی دوسرا واقعہ اگر ہو تب بھی اس کی بنیاد مختلف ہوتی ہے اور توجیہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف ہی ہوگی۔ ان میں منجملہ دوسری باتوں کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عاجز بندوں کے کاموں میں ایسی برکت عطا کرتا ہے کہ ان کا تھوڑا سا کام بھی ایک عظیم کارنامہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ وہ اس کا مادی اسباب کے پیمانے سے ہی ناپ تول کرے گا اور پھر ایک نتیجہ اخذ کرے گا۔ مثلاً اگر ہماری ۱۹۴۷ء کی تحریک کو دیکھا جائے یعنی اس کی تنظیم، منصوبہ بندی اور ذرائع و وسائل، تو کوئی ہوش مند آدمی جو صرف مادی اسباب کا سائنسدان ہے کبھی یقین نہیں کرے گا کہ اتنا عظیم واقعہ ان اسباب کے بغیر بھی معروض وجود میں آ سکتا ہے، مگر وہ فی الواقع ہوا۔ اسی طرح جب مسلم کانفرنس نے ۶۸/۶۹ میں "المجاہد" تحریک کا آغاز کیا اور مجھے اس کا سربراہ بنایا تو اس کا بھی تھوڑے عرصہ میں جو اثر مرتب ہوا اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا۔ ایک طرف بھارتی حکومت کو یقین تھا کہ حکومت پاکستان اس کی اصل محرک ہے اور وہی اس کی رہنمائی اور امداد کر رہی ہے۔ دوسری طرف اگر متار کہ جنگ کے قریب کوئی بھارتی فوجی کسی پہاڑی سے گر کر مر جاتا تو وہ اسے "المجاہد" کی کارروائی بتاتے اور سراسیمہ ہو جاتے تھے۔ بھارت نے خود بھی اور اپنے دوستوں کے ذریعے بھی حکومت پاکستان سے ضمانت طلب کی کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس تحریک کی امداد نہیں کرے گی بلکہ اس کو کچل دے گی، چنانچہ یہ ضمانت تحریری طور پر ان کو مہیا کی گئی۔ ادھر حکومت پاکستان کا خیال تھا کہ پاکستان کے سرمایہ دار اس تحریک کی پشت پناہی کریں گے اس لئے ان کو بھی پابند کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا اب بھی یہ خیال ہے کہ اس تحریک کے نام پر کروڑوں روپیہ جمع کیا گیا اور ہم لوگ خرد برد کر گئے یا ذاتی مصرف میں لائے مگر کسی کو معلوم نہیں کہ پاکستان کے کسی سرمایہ دار نے ایک کوڑی تک نہیں دی۔ محض چند دوستوں سے اس پورے عرصے میں صرف ساٹھ ہزار روپے لے کر ہم نے دفتر اور ضروری لٹریچر پر صرف کیا۔ یہ وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ میں نے پاکستان کے چند سرمایہ داروں سے رابطہ قائم کیا۔ مگر اس کا ردِ عمل

Marfat.com

جو کچھ ہوا مجھے ہی معلوم ہے۔

یہ مناسب ہے نہ قرین مصلحت کہ میں وہ روئیداد اب بیان کروں' البتہ جستہ جستہ بعض واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ایک بڑے سرمایہ دار نے ہمارے کچھ کارکنوں کو مبلغ پانچ صد روپے کا "گراں قدر" عطیہ مرحمت فرمایا جو میں نے واپس کروا دیا۔ جب کہ دوسرے ہی دن اس کا بیٹا گھوڑ دوڑ میں لاہور جا کر صرف چار لاکھ روپے کی "حقیر" سی رقم ہار گیا۔ ایک اور موقع پر مجھے ایک سرمایہ دار نے اپنے گھر بلایا اور اسی طرح کسی کام کے لئے مجھے پندرہ ہزار روپے دیئے جب کہ ہماری ضرورت اس سے بدرجہا زیادہ تھی تاہم میں نے وہ واپس بھجوا دیئے لیکن آج تک ندامت کا احساس ہے کہ میں وہاں گیا ہی کیوں تھا کیونکہ پیسے والوں کے پاس خدا' رسولؐ اور انسانیت کا مقصد صرف پیسہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ بے کار تصوّرات اور محض وہم و گمان ہیں' اچھا ہوا کہ اس تجربہ نے عمر بھر کے لئے ایک راستہ تو متعین کر دیا۔ "دعا دیتا ہوں راہ زن کو" والی بات ہو گئی۔ یہ بھی اسی کا عین فضل و احسان ہے۔ سرمایہ دار خواہ کسی بھی مذہب یا ملت پر ہوں ان کا مذہب خود سرمایہ ہی ہوتا ہے وہ کسی کو پیسہ دینے کے فلسفے کے مخالف ہوتے ہیں سوائے اپنی غرض کے۔ وہ روپیہ دیں گے تو حکومت کو پھر کسی سرمایہ دار کو اور سب سے آخری درجہ میں اپنے کسی ایجنٹ کو۔ وہ روپیہ اپنی اولاد کو بھی نہیں دیتے جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ روپیہ Invest کر رہے ہیں یعنی کاروبار میں لگا رہے ہیں۔ وہ اس سے منافع کا تخمینہ پہلے لگاتے ہیں اور پھر پیسہ نکالتے ہیں۔ خواہ وہ منافع دوسروں کی جان و مال کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ کسی تھانیدار کو تو ہزاروں روپے دے دیں گے اور افسروں کی خوشنودگی' راحت اور ان کے ساتھ وابستگی کی خاطر دل کھول کر خرچ کریں گے مگر کسی مسجد یا کسی دینی مدرسے کا مطالبہ ہو تو حقارت اور دل برداشتگی سے پانچ یا دس روپے بڑی مشکل سے دیں گے گویا خدا پر احسان کر رہے ہیں۔

رئیس الاحرار چودھری غلام عباس صاحب مرحوم لاہور میں مسئلہ کشمیر پر ایک کل جماعتی کنونشن کر رہے تھے۔ مجھے ساتھ لے کر ایک کروڑ پتی واقف کار کے پاس گئے' اس نے بات سنی تو بہت لمبا سانس کھینچا اور کہنے لگا "چودھری صاحب! آپ کو کیا پتہ ہے کہ ہم لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں" چودھری صاحب نے فوراً کہا "میاں صاحب! اللہ آپ کی حالت بہتر کرے' ہم لوگ کسی نہ کسی طرح کنونشن کر ہی لیں گے۔ آپ اتنے پریشان نہ ہوں" یہ تھی وہ امداد جو اس وقت ہمیں ملی۔ روپیہ در حقیقت جمع بھی اس کے اپنے پجاریوں اور "نیک و فرمانبردار" بندوں کے پاس ہوتا ہے' جو لوگ روپے کو محض ایک ذریعہ سمجھیں یا اسے امانت سمجھیں خدا کی اور خدا کے مستحق بندوں کی' ان کے پاس وہ آئے گا ہی کیوں اور آئے گا تو چیل کے گھونسلے میں ماس بن کر رہے گا۔ جن کا یقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور صحابہ کرامؓ کی حیات مبارکہ پر ہو اور جن لوگوں نے سرسری نظر سے ہی سہی' مگر خدائے پاک کے اس ارشاد کو پڑھا کہ وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۨ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ... الخ تو وہ کیسے کروڑ

Marfat.com

سردار عبدالقیوم، ذوالفقار علی بھٹو اور سردار محمد ابراہیم

Marfat.com

پتی اور سرمایہ دار ہو سکتے ہیں۔" مسلمان یا مومن تو دولت کا امین ہے مالک نہیں" سوائے اپنی ضروریات کے " اور یہ ضروریات والا معاملہ بھی محض عوام الناس کے لئے ہے ورنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھا ہوا تھا تو اسی دن ایک لاکھ درہم خیرات کر دیا مگر اپنے افطار کے لئے کچھ نہ رکھا۔ سرمایہ کیا اور سرمایہ کاری کیا۔

میرا سب سے بڑا سرمایہ جس نے مجھے پہاڑی کے ایک گم نام گوشے سے نکال کر کہاں کہاں سے کہاں تک روشناس کرایا' جتنا کروایا وہ پروردگار عالم کی خصوصی کرم نوازی اور اس کی دی ہوئی وہ توفیق ہے جس نے مجھے کچھ بنیادی اصولوں پر کاربند رکھا۔ اگر خدانخواستہ کسی وقت مجھ پر عتاب ہو جائے " العیاذ باللہ اور وہ رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو مجھ سے ہر لحاظ سے بدرجہا بہتر لوگ میرے ارد گرد موجود ہیں اگر میں خود کو بیچ دیتا' خواہ وہ کسی بھی قیمت کے عوض ہوتا تو یقیناً میں اس دولت سے محروم ہو جاتا۔ آج ایک پورا گروہ ایسا ہے جو صرف میری مخالفت کر کے اپنے مفادات حاصل کرتا ہے میری مخالفت کرنے والوں کو بھی خدا نے عارضی طور پر مستفید کیا' چہ جائیکہ میرے ہمدرد اور محبت کرنے والے اس کے فیض سے محروم رہے ہوں' کیا یہ کوئی کم درجہ کا احسان ہے اس ذات کا اپنے اس عاجز اور سرتاپا گناہوں میں غرق بندے پر؟ مجھے اور کیا چاہئے؟

آزادئ فکر کی نعمت اور اس کے اثرات

مولانا! اللہ تعالیٰ کی کرم نوازیوں میں ایمان کی دولت کے بعد آزادئ فکر جیسی کوئی نعمت نہیں ہے۔ لیکن فکر تب ہی آزاد رہ سکتی ہے جب وہ کئی دوسرے بندھنوں اور مجبوریوں سے بھی آزاد ہو بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ فکر کی آزادی کا دارومدار دل کی آزادی پر ہے۔ جو شخص اس نعمت عظمیٰ کی لذت کا شناسا ہو اور چاہتا ہو کہ اسے قائم رکھے تو اس کو اپنی رذیل خواہشات نفس اور ان کے طبعی تقاضوں کی قربانی دینا ہی ہو گی۔ ناجائز دولت تو درکنار اس شخص کے لئے ضرورت سے زائد جائز دولت بھی زہر قاتل ہے۔ اسی کے لئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے "بتان وہم و گمان " ان سب کو ترک کرنا ہو گا کیونکہ انہی کو اللہ پاک نے بھی "عدو" (دشمن) کے لفظ سے یاد کیا ہے اور وہی فکر کی آزادی کے لئے گراں بار بوجھ ہیں۔

اس فکر کی آزادی سے مجھے ایک اہم واقعہ یاد آیا جس سے معلوم ہو گا کہ فکر کی یہ آزادی دراصل میری فطرت میں ہی ودیعت کی گئی ہے' اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب تحریک آزادی ابھی شروع ہو رہی تھی غالباً ستمبر کا مہینہ ہو گا جس وقت سردار محمد ابراہیم خان بھی سرینگر سے محض اتفاقیہ بچ کر نکل آئے تھے۔ ان دنوں مری میں نواب مکھڈ مرحوم کے گھر پر ایک میٹنگ ہوئی جس میں نواب صاحب کے علاوہ سردار محمد ابراہیم خان صاحب اور اس وقت کے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر اللہ داد خان بھی

Marfat.com

تھے۔ شاید ایک دو حضرات ہم میں سے اور بھی ہوں اور میں بھی تھا میں محض اتفاقاً آزاد کشمیر کی طرف سے مری گیا ہوا تھا۔ میٹنگ میں یہ بات ہو رہی تھی کہ آزادیٔ کشمیر کی اس تحریک کا کیا کیا جائے۔ مختلف آراء تھیں۔ کسی کا خیال تھا کہ ڈوگروں کے ساتھ باعزت اور بامقصد سمجھوتہ ہو جائے تو مناسب ہے۔ کسی نے کہا کہ قائداعظمؒ نے حال ہی میں بیان دیا ہے کہ "کشمیر میری جیب میں ہے" اس لئے ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ بہرحال عام تاثر یہی تھا کہ جنگ کے علاوہ کوئی اور حل نکل آئے یہ بالکل طبعی امر تھا کیونکہ خود پاکستان کسی جنگ کے بغیر وجود میں آیا تھا اور ہماری تمام سیاسی قیادت اس وقت کے معروف سیاسی طریقہ کار سے باہر کچھ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ میں خاموش تھا۔ آخر میں اللہ داد خان صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا "اس نوجوان کی رائے معلوم نہیں ہوئی۔ یہ ابھی محاذ سے آرہا ہے" کہنے لگے کہ "آپ کی کیا رائے ہے" جب وہ باتیں کر رہے تھے تو میں اپنی حکمت عملی سوچ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سب غیر متعلق لوگ ہیں اور محض تفریح کر رہے ہیں۔ ان کو سرے سے حالات کا علم نہیں ہے۔ میں نے کہا "دیکھئے جناب، مہاراجہ نے فروری ۱۹۴۷ء سے ہی اپنی فوجیں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ متعین کرنا شروع کی ہوئی ہیں۔ اس کا مقصد پاکستان کے ساتھ رشتہ پر پہرہ بٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ وہ اس سرحد کو فوج کے ذریعے مکمل طور پر بند کرنا چاہتا ہے۔ جب یہ مکمل بند ہو جائے تو پھر کشمیر کو حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ پاکستان کا براہ راست فوجی حملہ ہے۔ مگر میرا یقین ہے کہ وہ حملہ کبھی بھی نہیں ہو سکے گا اس لئے یہی وقت ہے کہ ہم عوامی تحریک کے ذریعے ریاست پر قبضہ کریں" اللہ داد خان دوڑ کر میری طرف آئے، بغلگیر ہوئے اور کہنے لگے "اس نوجوان نے بالکل درست کہا ہے" اور میری طرف دیکھ کر کہا "آپ اپنا کام کریں، ہم سے جو امداد ہو سکے گی وہ ہم مہیا کریں گے" میں آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے وہ مجھ سے کئی سال بڑے لوگ تھے۔ عمر میں بھی اور مرتبہ اور تجربہ میں بھی۔ وہ کیا بات تھی جس نے مجھے ایسی بات کرنے پر دلیر کر دیا تھا؟۔

ضمناً ایک بات کا ذکر کر دوں کہ یہ بے سروسامانی کیا تھی اور قدرت کیا چاہتی تھی۔ کیا تعلق تھا آزادی کی اس عظیم تحریک کے ساتھ ڈپٹی کمشنروں کا یا کسی اور ملازم کا۔ قائد کا فرمان وہ تھا' حکومت پاکستان ابھی خواب سے بیدار ہونے کی حالت میں تھی' پاکستان کی فوج کو پورے ہندوستان میں ہندو اور انگریز نے مل کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بکھیر دیا تھا' پاکستان کے حصے کا اسلحہ بھی اس طرح منتشر کر دیا تھا کہ اس کو جمع کرنے میں کم از کم ایک سال کی مدت درکار تھی۔ ایسے میں تحصیل دار مری سلطان مقصود' اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے۔ ہمارے پاس آئے اور اپنے دو مقامی دوستوں راجہ گل محمد خان اور راجہ بشیر محمد صاحب کو ساتھ لے کر مال روڈ پر چندہ جمع کیا۔ اس طرح چند گھنٹوں میں انہوں نے میرے لئے درے کی دس بندوقیں مہیا کیں۔ وہ بھی نقل و حرکت کی ایسی سنگین پابندی میں کہ اس وقت وہ بجائے خود ایک معجزانہ بات تھی۔ بعض کوتاہ اندیش اور حالات سے بے خبر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ

Marfat.com

تحریک نہ شروع ہوتی تو پوری ریاست ہی مل جاتی۔ مگر وہ پوری ریاست ہمیں نہ ملتی بلکہ بھارت کو مل جاتی اور آج ہم پاکستان کے اس آخری دفاعی حصار سے بھی محروم رہتے۔ پاکستان کا بھی خدانخواستہ وہی حشر ہوتا جو گورداسپور کا ہوا تھا کیونکہ وہ بھی ریاست پر بھارت کے قبضہ کی سازش کا ہی حصہ تھا۔ واضح رہے کہ آکن لیک اس وقت فوجوں کا مشترکہ کمانڈرانچیف تھا۔ ان حالات میں لارڈ مونٹ بیٹن کو مشترک گورنر جنرل ماننے میں قائداعظم کے پیش نظر جو اور مصلحتیں رہی ہوں گی ان کے علاوہ اگر ایسا ہو جاتا تو کشمیر کی آزادی کا سوال ہی پیدا ہوتا نہ پاکستان کی سلامتی و بقا کا۔ قائداعظمؒ کا وہ فیصلہ بڑی مومنانہ فراست و بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

یہی وہ اصل وجہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ساتھ میرا فکری تصادم رہتا ہے، خصوصاً حکومت کے ساتھ۔ کیونکہ آزادی کے باوجود ہمارا ذہن غلام ہے اور جو حکمران ہو جائے اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی سوچ و فکر تو کیا ان کے قلب و نظر پر بھی پہرہ بٹھا دے، بخلاف آزاد قوموں کے کہ وہ تو اپنے ہاں فکری آزادی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور اس سے استفادہ کرتی ہیں۔ میرے متنازعہ فیہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

چاہئے تو یہ کہ جب ایک انصاف پسند شخص کوئی فضول یا پیچیدہ بات سنے یا دیکھے تو اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرے اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو اس کی کوئی اچھی، نہ کہ بُری تاویل کرے مگر ہمارے ہاں ایک تو امیر بننے کی دوڑ اس قدر تیز ہے کہ کسی بھی اخلاقی قدر کا کوئی احساس یا ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے تاویلات تو لامحالہ مخالفت کی بنیاد پر ہی ہوں گی یہ محض سیاست پر ہی کچھ موقوف نہیں بلکہ اس کا اثر تو زیادہ تر مذہب پر ہے وہ بھی ایک وجہ ہے چونکہ ہماری بنیاد میں ہی زہر گھول دیا گیا ہے، اس لئے اس وقت ہم زندگی کے چشمے سے بہنے والے پانی کو کسی بھی مقام سے پئیں گے تو وہی زہر اس میں گھلا ہو گا۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر میں کسی وقت اس جذبے کا اظہار کروں تو بعض دوست کہتے ہیں کہ یہ وہابی ہو گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بریلوی یا شیعہ ہو گیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ جو بات بھی قابل تاویل ہے اس کی تاویل نہ تو سیاق و سباق سے جدا کر کے کرنا عقل مندی اور انصاف ہے نہ اس کی محض کسی عناد کے باعث مخالف تاویل کرنا مذہب، سیاست اور ایمان کے لئے مفید ہے۔ اگر ہمارے ہاں دیکھا جائے تو اکثر و بیشتر فساد اور خصومت کی بنیاد یہی تاویلات ہیں جس سے پوری زندگی شکوک و شبہات اور بدگمانی کی نذر ہو کر رہ گئی ہے۔

یہی فکری آزادی تھی جس نے چودھری غلام عباس مرحوم کو بھی کسی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے دور رکھا۔ انہوں نے ہجرت کی، فاقے برداشت کئے، اپنے ہی مطلوب پاکستان کے ہاں حکومتوں کے ناروا سلوک کو برداشت کیا مگر فکری آزادی کو پامال نہ ہونے دیا جس کا تھوڑا سا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ زندگی رہی تو اس بارے میں مزید کچھ قلم بند کروں گا۔

Marfat.com

حکومتوں اور حکمرانوں کے ساتھ نسبت

دیکھنا یہ بھی چاہئے کہ عامل اور معمول میں کوئی ظاہری یا باطنی نسبت تو ہو' کیونکہ اس کے بغیر یہ قریبی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کے ساتھ میری نسبت کیا ہے' کیا میرا سیاسی کردار کسی بھی حکمران یا حکومت کا مرہون منت تھا' کیا میں سرمایہ کے زور سے سیاست میں ہوں' کیا کوئی حکومت اپنے زور سے ہم سے وہ جہاد کروا سکتی تھی جو ہم نے ۱۹۴۷ء میں کیا' کیا کوئی حکومت سیاسی سوچ میں ہم سے آگے یا بہتر تھی اور کیا کوئی حکومت ہمارے ہاں آزادئ فکر کی حوصلہ افزائی کرنے والی تھی۔ (جس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اپنے خلاف کارروائی کی حوصلہ افزائی کرے) کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے' جو بار بار ثابت ہو چکا ہے کہ ہماری حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری سیاسی سوچ زیادہ واضح اور ہر لحاظ سے بہتر اور ملک کے وسیع تر مفادات میں تھی جس کا اعتراف بھی کیا گیا اور غلطیوں کے ازالہ کی کوشش بھی کی گئی۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ہم واقعات سے چشم پوشی نہ کریں تو یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ سوچ تو سوچ ہے ہماری اطلاعات بھی بعض دفعہ حکومت کی اطلاعات سے بدرجہا بہتر اور بروقت تھیں۔

مجھے قلبی مسرت ہوتی اگر کوئی حکومت ایسی ہوتی جس کے لئے میں کام کر سکتا لیکن جس سے میری سوچ بہتر اور اطلاعات بہتر ہوں' میں اس کے لئے کیا کام کروں گا اور اس کو یہ جرأت کیسے ہوگی کہ وہ مجھے اپنی کسی غرض کے لئے کام پر لگائے؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلہ پر عارضی طور پر یہ سوچ یکجا ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو کسی معاوضے کی بات کیسے درمیان میں آئے گی وہ تو پھر خود اپنے لئے ہی کام کرنے کے مترادف ہوگا جیسے ۱۹۶۵ء میں مرحوم فیلڈ مارشل اور ہمارے درمیان اختلافات نقطۂ عروج پر تھے لیکن جب جنگ چھڑ گئی تو میں نے اسی صبح مظفر آباد میں غیر مشروط حمایت کا اعلان کر دیا۔ ان کو تو پتہ بھی نہیں تھا۔ پھر ہم نے خان عبدالحمید خان کے ساتھ تعاون کیا جب کہ وہ اپنی شرافت کے باوجود جنگ اور اس قسم کے ماحول سے شغف نہ رکھتے تھے اور نہ ہمارے نمائندے تھے۔ اسی طرح بھٹو صاحب کے وقت میں مذاکرات کے ضمن میں ہوا تو اس میں کرایہ کشی اور عوض معاوضہ کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔

میں نے تو اللہ کے فضل و کرم سے اس کے دیئے ہوئے میں سے خود سیاست کو ہی کچھ دیا ہے' اس سے لیا کچھ نہیں۔ یہ امر بھی کسی وضاحت یا تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ میں تو سیاست دوسروں کے لئے کرتا ہوں جب کہ اکثر لوگ سیاست صرف اپنی ذات کے لئے کرتے ہیں لیکن جب "کچھ لو کچھ دو" والی بات آ جائے تو پھر وہ اخلاص کہاں سے آئے گا اور وہ لطف جو اخلاص کی تلخیوں اور سختیوں سے نچڑتا ہے وہ کہاں میسر ہوگا؟

Marfat.com

بے بصیرت حکمرانوں کا طرز عمل

اصل میں ہمارے ہاں یہ قصہ (طرز عمل) ایک خاص حیثیت اختیار کر گیا ہے اس کی بڑی وجہ ہمارے اکثر بے عقیدہ ' بے بصیرت اور دانش مندی سے محروم حکمران ہیں۔ ہوتا بالعموم یہ ہے کہ اگر حکومت سے اختلاف کرنے والا کوئی شخص کسی وقت نیک نیتی سے بھی کسی بات پر اتفاق رائے کا اظہار کر دے تو ان سرکاری ملازموں کی چاندی ہو جاتی ہے بلکہ آج کل تو کہہ سکتے ہیں کہ "سونا" ہو جاتا ہے۔ جو ملازمین مخالفین کی خرید و فروخت کرنے اور ان کو ہموار کرنے پر مامور ہوتے ہیں وہ فوراً رپورٹ دیتے ہیں کہ "جناب ہم تو بہت دیر سے اس پر کام کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اسے قابو میں کیا ہے اور اتنی رقم اس پر صرف کی ہے" اب ظاہر ہے کہ حسابی اندازوں میں تو یہ بات مسترد نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ شاید نہ کوئی لین دین ہوا ہوتا ہے اور نہ کوئی ملاقات ہی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن وہ رقم اس طرح اپنے مصرف میں لانے کے لئے رخصت ضرور مل جاتی ہے۔ بعض سیاستدان 'یقیناً ایسے بھی ہوں گے جو تعمیرات عامہ کے ٹھیکیداروں کی طرح ہوں گے مگر ظاہر ہے کہ اس پر ہر ایک کو قیاس کرنا مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ جن کے ہاں سیاست نام ہے صرف دھوکے 'فریب' دغا اور دجل کا وہ اگر ایسا نہ کریں تو کیا کریں؟ العیاذ باللہ من ذلک اللہ اپنے عاجز بندوں کو محفوظ رکھے۔

سہالہ لائے جانے کے اسباب

سہالہ میں میرے بلائے جانے کے بارے میں بھی طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں۔ اطلاعات ' تاویلات اور پھر اپنی اپنی ذات پر قیاس کرنا۔ یہ سب باتیں اس کی تشریح و توجیہ میں شامل ہیں۔ مجھے تو صرف دو اسباب کا کماحقہ علم ہے۔ اسی طرح سہالہ سے مجھے باقی مرکزی زعماء کے ساتھ رابطہ کے لئے مقرر کیا گیا تو وہ کس نے کیا اور مقصد کیا تھا ' اس کے بارے میں بھی کئی خیال ہیں۔ یہاں تک کہ خود قومی اتحاد کے مرکز میں بھی صحیح اطلاع نہیں ہے۔ یہ سب کچھ دراصل اتنی تیزی کے ساتھ اتنے کم وقت میں اور ایسی ہمہ گیر ہنگامی حالت میں ہوا کہ سب لوگوں کا ایک ہی طرح باخبر ہونا ممکن نہیں تھا پھر ایک فریق (حکومت) کا کام بھی کسی مقرر نہج پر تھا نہیں۔ وہ بھی لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر تھا اور عین اسی رفتار سے غلط فہمیاں بھی پیدا کر رہا تھا۔

Marfat.com

مذاکرات سے احتراز اور اس کے نتائج

سہالہ لائے جانے کے بارے میں تو اولاً یہ ہوا کہ ہماری جماعت مسلم کانفرنس کے کچھ زعماء نے جب دیکھا کہ باقی سب فریق سہالہ جمع ہیں اور صلاح مشورے ہو رہے ہیں تو انہوں نے چودھری ظہور الٰہی اور مفتی صاحب مرحوم پر زور دیا کہ سردار عبدالقیوم کو بھی سہالہ لایا جائے چنانچہ مفتی صاحب نے اور غالباً ان کے دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کا مطالبہ کیا۔ دوسرے میرا اغلب خیال یہ ہے کہ جب میں گھر پر نظربند تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ قومی اتحاد نے ایک قرارداد کے ذریعہ اعلان کیا ہے کہ وہ وزیراعظم کے ساتھ کوئی ملاقات نہیں کریں گے۔ ان دنوں جتنے دوست مجھے ملنے آتے رہے میں اس فیصلہ کے بارے میں سب کو کہتا رہا کہ یہ فیصلہ اصولاً غلط ہے فعلاً نہ ملنا تو ممکن ہے مگر اس کا اصولاً اعلان کر دینا سیاست میں فاش غلطی ہے اور سیاست کو غیر سیاسی رخ دینے کے مترادف ہے۔ میں کہتا تھا کہ صلح حدیبیہ کو دیکھیں اور پھر روزمرہ کے واقعات کو لیں۔ لوگ تو عین میدان جنگ میں بھی گفت و شنید اور مذاکرات کے اصول سے فرار یا انکار نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ ہم اپنے ہی ملک میں اس اصول سے انکار کر دیں میں ذاتی طور پر مذاکرات اور تعاون سے گریز یا انکار کو ہمیشہ اس فریق کی کسی کمزوری یا احساس کمتری پر محمول کرتا رہا ہوں میری یہ رائے بہت کھلی اور واضح تھی اس لئے عین ممکن ہے بلکہ اغلب یہی ہے کہ مجھے سہالہ اسی مقصد کے لئے لایا گیا ہو کیونکہ جیل میں بھی جو دوست وقتاً فوقتاً مجھے ملنے آتے رہے ان کو بھی میں یہی کہتا رہتا اور جیل خانے سے تو میرے بارے میں منٹ منٹ کی خبر حکومت تک پہنچائی جاتی تھی چنانچہ جب مجھے پلندری سے سہالہ لایا گیا اور بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی مذاکرات کے لئے ہی کہا میں نے بھی سہالہ میں اپنی میٹنگ میں اسی پر زور دیا کیونکہ مذاکرات سے انکار کے باعث دوسری قباحتوں کے علاوہ خود ہماری اپنی سیاسی پوزیشن بہت خراب ہو رہی تھی ایک تو حکومت کی جانب سے ہمیں اسی بات کے لئے رسوا کیا جا رہا تھا دوسرے یہ پراپیگنڈہ بھی عام تھا اور ہمارے اپنے کارکن بھی اس سے بے حد متاثر تھے کہ ہم لوگ بھٹو صاحب کے ساتھ میز پر بیٹھ کر بات کرنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ ہم ڈرتے ہیں کہ وہاں ہمیں شکست ہو جائے گی یہاں تک کہ جب میں اس مذاکراتی دورے پر تھا اور لاہور میں مولانا مودودی مرحوم سے ملنے گیا تو باہر لان میں کارکنوں کی ایک بڑی تعداد میرے ساتھ بات کرنے کے لئے منتظر تھی۔ انہوں نے پہلا سوال یہی پوچھا کہ بھٹو تو بہت ہوشیار ہیں؟ میں نے کہا اگر آپ اپنے لیڈروں کو احمق سمجھتے ہیں تو پھر دوسرے لیڈر منتخب کر لیں وغیرہ وغیرہ۔

یہی وجہ تھی کہ جب سہالہ میں پہلی مرتبہ بات نہ بنی اور ہم سب کو دور دراز جیل خانوں میں بھیج دیا گیا تو وہاں سے نواب زادہ صاحب کو اور مجھے پھر واپس سہالہ لایا گیا مفتی صاحب مرحوم و مغفور کو تو وہیں رہنے دیا گیا تھا! اس کی وجہ بھی وہی تھی کہ مفتی صاحب اور نواب زادہ صاحب بھی مذاکرات کے بارے میں

Marfat.com

نرم رویہ رکھتے تھے اور کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے۔ نہ مارشل لاء کو دعوت دینے کے حامی تھے۔ مذاکرات نہ کرنے کا ایک واضح نقصان ہمارے خیال میں یہ بھی تھا کہ اس سے فوج کو مداخلت کرنے کا موقع میسر آئے گا اور فی الواقع اگر ہم مذاکرات پر نہ آتے تو یہ مارشل لاء دو ماہ قبل نافذ ہو جانا چاہئے تھا۔ جو لوگ اسی بات کے خواہش مند تھے، ان کے نزدیک تو میں واقعی بہت بڑا مجرم ہوں گا۔

مذاکرات کا آغاز

بہت لوگوں کو اس پر بے حد اچنبھا ہوا کہ آخر ہم نے مذاکرات کا اصول کیسے تسلیم کر لیا۔ ہمارے صحافی حضرات نے میرے دورے کے دوران اس کو بہت کرید امگر کچھ معلوم نہ کر سکے۔ بھٹو صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا۔ مذاکرات کے بارے میں میری اس کوشش کے دوران بھٹو صاحب کی بڑی جذباتی خواہش تھی کہ میں یہ نہ بتاؤں کہ مذاکرات کیسے شروع ہو رہے ہیں یعنی بھٹو صاحب نے کیا نرمی اختیار کی ہے۔ چنانچہ اس وقت کسی کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ کراچی کے صحافی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں اب فن صحافت چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کرنا چاہئے۔

وزیر اعظم کی سہالہ میں آمد

سہالہ میں جب ہمیں اطلاع دی گئی کہ وزیر اعظم کل آ رہے ہیں تو ہم تینوں نے ممکنہ امور کا جائزہ لیا اور مشورہ کیا۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ اگر کوئی نئی صورت ہوئی تو ہم اپنے بقیہ ساتھیوں کے بغیر کوئی گفت و شنید نہیں کریں گے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ ان کے ساتھ کیسے مشورہ کیا جائے گا جب کہ وہ سب بکھرے ہوئے ہیں اور خاص کر جب یہ خیال بھی ہو کہ اگر پھر بات نہ بنے تو سب حضرات کو مزید دقت اور تکلیف کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ ہم خود وزیر اعظم کی بات سن لیں اور اگر اس میں کچھ ہو اور پہلے والی بات کا اعادہ نہ ہو تو پھر باقی دوستوں کے ساتھ مشورہ کے بارے میں سوچیں گے۔ وزیر اعظم اور آپ (مولانا کوثر نیازی) کے وہاں آنے سے قبل ہی ہم آپس میں یہ بات طے کر چکے تھے۔

رابطہ کا تاریخی سفر

مولانا! آپ کو اچھی طرح یاد ہو گا کہ دوسرے دن جب آپ لوگ آئے تو رسمی گپ شپ کے بعد وزیر اعظم نے کہا "اچھا بھائی ہم نے انتخابات کروانے کی بات مان لی ہے، اب مذاکرات شروع ہونے

Marfat.com

ذوالفقار علی بھٹو، مفتی محمود، نواب زادہ نصراللہ خان، پروفیسر غفور احمد

Marfat.com

چاہئیں " جناب مفتی صاحب نے کہا " ابھی تو ہم نے باقی دوستوں کے ساتھ مشورہ کرنا ہے " تو وزیر اعظم نے کہا " آپ تو ایک بیان میں یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو ہم مذاکرات کریں گے خواہ اس میں کوئی شامل ہوتا ہے یا نہیں " ۔ مگر ہمارا مؤقف یہی تھا کہ ہم ان کے مشورے کے بغیر ان کی رائے کا اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تبدیلی تو بہرحال ان کے علم میں نہیں ہے۔ اس طرح پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ باقی دوستوں کے ساتھ جو ملک بھر میں دور دراز جیل خانوں میں قید تھے بات کیسے کی جائے۔ ہم نے ان کو سہالہ لانے کی تجویز سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب بھی حسب عادت غالباً یہی چاہتے تھے کہ ایک تو قومی اتحاد میں پھوٹ بھی پڑ جائے اور مذاکرات سے انکار کی ذمہ داری بھی اتحاد پر ہی ہو۔ اس لئے وہ بھی ہمارے باقی اصحاب کو سہالہ لانے کے بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ اب صرف یہی ممکن تھا کہ وہاں جا کر ہی ان سے بات کی جائے۔ کون اس مہم پر جائے' اس پر مفتی صاحب نے انگوٹھے کی تکلیف وغیرہ کے باعث انکار کر دیا' نواب صاحب کو اگلے دن دور دراز سے جیپ پر بے دردی سے لائے جانے کی مشقت اٹھانا پڑی - ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی' تیسرا میں تھا۔ مفتی صاحب نے پوچھا " آپ جا سکتے ہیں " میں نے کہا کہ " ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا " اس وقت تو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ مشن کتنا نازک' مشکل اور اہم ہو گا۔ وزیر اعظم نے' آپ کو یاد ہو گا' مجھ سے پوچھا " آپ رہا ہو کر جانا چاہتے ہیں یا اسی طرح " میں نے پوچھا کیا " آپ نے مجھ سے کوئی پوچھ کر مجھے گرفتار کیا تھا جواب مجھ سے آپ پوچھ رہے ہیں؟ " اس پر ہنسی مذاق ہوا اور بات ختم ہو گئی۔ دوسرے دن صبح میری رہائی کے احکامات آ گئے اور میں اس تاریخی سفر پر روانہ ہو گیا۔ اگر مذاکرات کامیاب ہو جاتے تو وہ سفر تاریخ ساز بھی کہلانے کا مستحق تھا۔ بعد کے واقعات تو پھر ان دنوں اخبارات کی اہم ترین خبریں ہوا کرتے تھے۔ مجھے کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ساتھیوں کا ردِّعمل

یہیں میں ایک ایسی بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق پھر بعد میں رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ بڑا گہرا اور اصولی تھا۔ سہالہ سے جب پہلی بار ہم سب کو ملک بھر میں بکھیر دیا گیا تو وہ بہت تکلیف دہ کام تھا۔ بڑی بے دردی سے ہر ایک کو سزا کے طور پر سفر کروایا گیا بلکہ عام اخلاقی مجرموں کی طرح سلوک کیا گیا تھا اور جیل خانوں میں بھی سلوک اچھا نہ تھا اس بارے میں میں نے ان ہی دنوں کافی کچھ کہا تھا۔ تاہم ان حالات میں ان قیدی لیڈران کا تلخ ہو جانا طبعی امر تھا لیکن ان حضرات نے جس بردباری' حب الوطنی اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا وہ ایک مثال ہے۔ یہ میں نے اس لئے کیا تاکہ فوج کو مداخلت کا موقع نہ ملے، کیونکہ

——— فوج کو ایک حکم کے ذریعے کسی بھی محاذ پر متعین تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس محاذ سے ان کو

Marfat.com

ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان

Marfat.com

واپس بلانے کے لئے صرف حکم کافی نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلہ میں کئی دوسرے عوامل اور عناصر کو بھی مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فوج کو محاذ پر مقرر کرنا، فن کا ایک پہلو ہے اور محاذ سے واپس لانا ایک دوسرا پہلو۔ اور یہ بالکل ضروری نہیں کہ جو شخص فوج کو محاذ پر متعین کرنے کا حکم دیتا ہے اس میں ان کی واپسی کی اتنی ہی صلاحیت ہو اور اس کی ایک تاریخی مثال ان اعلانات سے بھی دی جا سکتی ہے، جو دوسری جنگ عظیم کے وقت اتحادیوں کی طرف سے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نشر کی جاتی تھی کہ ہماری فوجیں بڑی کامیابی سے پیچھے ہٹ آئی ہیں۔ اس وقت تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن بعد میں لوگوں کو اس حکمت عملی کی سمجھ آئی۔
بہرحال مذاکرات کے سلسلے میں ایئر مارشل اصغر خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں انہوں نے سرسری طور پر ہی کہہ دیا جانے دو مذاکرات کو، جب میں نے کہا کہ "پھر اس کے نتیجہ میں فوج آجائے گی تو وہ کہنے لگے "آتی ہے تو آنے دو" اس پر میں نے کہا "اچھا ٹھیک ہے۔ مگر ایک دو باتیں سمجھا دیجئے کیونکہ قومی اتحاد میں اس بارے میں آپ ہی کی رائے زیادہ صائب اور معتبر ہو سکتی ہے اولاً یہ کہ جب اس طرح کوئی فوج ملکی سطح پر ملوّث ہو جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کو آسانی سے علیحدہ کیا جا سکے؟ کہنے لگے "کافی مشکل کام ہے"۔ دوسرا میں نے کہا "میں موجودہ لوگوں سے بالکل واقف ہوں، آپ ان سب کو جانتے ہیں کہ یہ لوگ اگر نیک نیتی سے چاہیں بھی، (بھلا وہ کیوں ایسا چاہیں گے) تب بھی کیا ان میں وہ قابلیت اور صلاحیت ہے کہ پوری فوج کو ملوث کرنے کے بعد جلد ہی واپس بھی نکال لیں"۔ ایئر مارشل اس باریکی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے "ٹھیک ہے۔ مذاکرات کریں"۔ تو اس طرح ہم ان مذاکرات کی میز پر تھوڑی دیر کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ ضمناً ان مذاکرات کی ناکامی کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر تنہا عائد نہیں کی جا سکتی تاہم جیسا کہ آپ نے ذکر کیا اگر وزیر اعظم ۳ مئی والا میرا مشورہ مان لیتے تو ایک حد تک ممکن تھا کہ شاید حالات کی اصلاح ہو جاتی۔ ایک حد تک، میں نے اس لئے کہا کہ ہمیں تیسرے فریق کی تیاریوں کا تو علم تھا مگر اس کے عزائم کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جانے کے باوجود بھی وہ فریق عین آخری وقت میں پیچھے ہٹنے کی پوزیشن میں ہی نہ ہوتا۔

کمیونسٹ ہونے کا الزام

قومی کارکنوں کے بارے میں شکوک و شبہات کس کس طرح پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کئے جاتے ہیں، اس کی ایک اور مثال دیکھئے۔ ۱۹۵۲ء میں جب کہ میں راولپنڈی سنٹرل جیل میں تھا تو شروع شروع میں ایک دن ہمارے کشمیر سی آئی ڈی (جو مرکزی حکومت کا ادارہ ہے) کے ایک انچارج سید عباس علی شاہ صاحب میرے پاس آئے۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ ان کو خوش رکھے اور عمر میں برکت دے، کہنے لگے "میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں" میرے نزدیک تو انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ فرائض کی بجا آوری

Marfat.com

کا تو مجھے کوئی گلہ ہو نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا "شاہ صاحب! ہم تو آپ کے نانا جی کا کلمہ پڑھتے ہیں' آپ مجھ سے کیوں معافی مانگ رہے ہیں اور مجھے شرمندہ کر رہے ہیں" انہوں نے بہت اصرار کیا' تو میں نے پوچھا "بات کیا ہے" کہنے لگے "پہلے معاف کرو پھر بات بتاؤں گا" میں نے کہا "بس ٹھیک ہے اللہ آپ پر مہربانی کرے" کہنے لگے "میں حکومت کو کئی سال سے مسلسل لکھتا رہا ہوں کہ سردار قیوم کمیونسٹ ہے اور اس کی یہ نماز اور وظیفے سب اسی حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ اب تمہارے یہاں پاس رہنے کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا" میں نے کہا "اس میں کیا ہے' آپ حکومت کو صحیح بات لکھ دیں" وہ کہنے لگے "اصل بات یہی ہے جس کے لئے معافی مانگ رہا ہوں۔ اب میں یکا یک ایسا کر نہیں سکتا"۔

نازک مزاج شاہان

اس لحاظ سے دیکھیں تو صاحبزادہ فاروق علی صاحب کی بات بہت ادنیٰ معلوم ہوتی ہے' یہاں کیا نہیں ہوتا اور کیا نہیں ہو رہا ہے۔ زیادہ نہیں مگر ایسی ہی ایک دو اور باتوں کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ تاہم یہ واقعہ اس دور کا ہے جب کہ ہمارے ملازمین انگریز کے تربیت یافتہ تھے۔ ان میں ابھی ایک جذبہ موجزن تھا۔ ان کی لیاقت و قابلیت بھی قابل رشک تھی۔ اب تو کوئی کیا کہے کیا نہ کہے۔ بعد کی حکومتوں نے جہاں ملک کے دوسرے معاملات میں اپنی تاریخی ناقابل ذکر کارکردگی کا مظاہرہ کیا' وہاں ہماری سروسز کو بھی اپنی دستبرد سے محفوظ نہ رہنے دیا' ان کو تحفظ دینے' ان کی لیاقت و قابلیت میں اضافہ کرنے اور ان میں خود اعتمادی بحال کرنے کی بجائے فخر اس میں سمجھا گیا کہ سرے سے ان کی کمر ہی توڑ دی جائے' کہتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید نے کسی نجومی کو محض اس لئے قید کیا تھا کہ اس نے صحیح بات کیوں بتائی تھی۔ کیونکہ وہ بات بادشاہ کی طبیعت کو اس وقت ناگوار محسوس ہوئی تھی۔

وہ تو صرف ایک منفرد واقعہ تھا مگر ہمارا تو شب و روز ہی یہی ہو گیا ہے' جس کسی سرکاری ملازم نے اپنے فرض منصبی کی بجا آوری کے طور پر صحیح قانونی رائے دی تو اس کو ہمارے اہل دل و دماغ حکمرانوں نے گستاخ' بے ادب اور تخریب پسند گردانا اور سب سے پہلے انہی کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا تاکہ حکمران کے اناپ شناپ احکامات اور ان کی جائز و ناجائز خواہشات کی تعمیل و تکمیل ہوتی رہے۔ بعض حکمرانوں نے تو اپنی علمی و فکری بے بضاعتی کا انتقام بھی ان ہی سے لیا اور اس طرح اپنے احساس کمتری کا مداوا کیا۔ اس کے لئے انہوں نے ہر صاحب علم و فہم کو کانا کر کے نکال دیا۔ اگر کوئی چشم بد سے بچ گیا تو یہ محض حادثہ کہا جا سکتا ہے لیکن جو لوگ بچ گئے ان میں نہ وہ شوق رہا نہ اپنی قابلیت کے اظہار پر ہمت رہی اور نہ اقدام پر ابھارنے والا جوہر قابل' بلکہ وہ خود اعتمادی جو کسی بھی پیشے یا فن کی اصل روح ہوتی ہے' اس کو تو ہتھوڑوں سے مار مار کر نہ بہ زمین کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کا جو منطقی نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا۔ ہر بات میں غیر ملکی

Marfat.com

ماہرین کی ضرورت اور ان کی محتاجی۔ وہ اگر اس ملک کے خلاف ہی رائے دیں تو وہ بھی بسروچشم قبول' بلکہ ایک الہامی رہنمائی کے مترادف۔ ملکی ماہرین کی خدمات سے ملک و قوم کی محرومی اس پر مستزاد۔

سروسز کا استحصال

دراصل اس تندو تیز اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے سے بھرپور کام لینے کے لئے چاہئے تو یہ تھا کہ سوار اپنی اہلیت میں اضافہ کرتا مگر ہوا یہ کہ ان شہ سوار خان صاحبوں نے گھوڑے کو ہی سیدھا کرنا شروع کیا۔ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ نہ ٹانگ چھوڑی نہ سر' نہ کان۔ اس کو گھوڑے کی بجائے ایک لادو ٹٹو بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ کیونکہ اصل میں ہمارے یہ شہ سوار خان لادو ٹٹو پر بھی ابھی سواری کے قابل نہ تھے۔ اسی طرح سروسز کو جو خالصتہً قومی ملازم ہوتے ہیں' ذاتی نوکروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہماری قومی بدنصیبی میں یہ بات بھی ایک مؤثر عنصر ہے ورنہ ہماری سروسز کے لوگوں پر ان کی علمیت' قابلیت' ذہانت' صلاحیت اور محنت پر کوئی بھی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی تھی۔ میرے نزدیک تو وہ کئی دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی سروسز سے بدرجہا بہتر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بھی بعض وہی کمزوریاں موجود ہیں جو اس قوم کا خاصہ بن گئی ہیں مگر ان کی زیادہ تر کمزوری یا نقص نالائق حکمرانوں کی موجودگی میں ان کی علمیت اور ذہانت کے باعث ہے اور یہ بالکل فطری عمل ہے۔ کوئی بھی لائق و فائق آدمی ایک نالائق کے ماتحت پوری دیانتداری سے کام نہیں کر سکتا۔ وہ دراصل ترقی معکوس کرتا رہتا ہے۔

ایک دوسرا سبب جو ہماری سروسز کے لئے مضر ثابت ہوا وہ ہماری سیاست کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ سیاست کی کرسیاں چونکہ خالی ہیں اس لئے ہر کس و ناکس ان کی طرف دوڑ رہا ہے۔ اس بات کی فکر نہیں ہے کہ اس کے تقاضے کیا ہیں اور اس کے لئے کس صلاحیت کی ضرورت ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اوپر پہنچ جاتا ہے تو وہاں بیٹھ کر پھر وہ الف بت سیکھنا شروع کرتا ہے اور جب وہ کچھ سیکھ لیتا ہے تو اس کا دور حکومت ختم ہو گیا ہوتا ہے۔ دوران حکومت تو سیکھنے کا موقع ہی بہت کم ہوتا ہے۔ جمال عبدالناصر نے چھ سال حکومت کرنے کے بعد کہا تھا کہ اسے اب معلوم ہوا ہے کہ کار حکمرانی کیا ہے۔ یہ تو ایک کامیاب حکمران کی بات تھی اگرچہ ان کی پالیسی سے اختلاف الگ بات ہے۔ پھر یہ ایک اور طرفہ تماشا ہے کہ ہمارے حکمران سیکھتے بھی ملازمین سے ہی ہیں جن کو انہوں نے خود کسی قابل نہیں چھوڑا ہوتا۔ گویا پہلے استاد کو نالائق بناتے ہیں پھر اس سے سیکھتے ہیں۔ عام طور پر تو کوئی سیکھتا بھی نہیں بلکہ تقاضا یہ کرتے ہیں کہ جو کام حکمران کا ہے وہ بھی ملازمین ہی کریں لیکن زندہ باد حکمران کی ہو۔ ایسے میں عملاً یہ ہوتا ہے کہ ملازمین ہی پالیسی بناتے ہیں' وہی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور پھر وہی اس پر عمل کرنے کا آلہ بھی ہیں۔ یہی وہ انتہائی غلط اور متناقض حیثیت ہے جس نے اس ملک کے انتظام و انصرام اور اس کی

Marfat.com

سردار عبدالقیوم خان اور خان عبدالولی خان

Marfat.com

معیشت کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ محض اس لئے کہ انسانی فطرت آسان پسند ہے۔ ہم لوگ تو خدا اور اس کے رسولؐ کے بنیادی فرامین میں بھی رخصت تلاش کرنے کی آرزومند ہیں۔ اس لئے جب ایک ہی کارکن کو منصوبہ بھی بنانا پڑے اور اس پر عمل بھی اسی نے کرنا ہو تو وہ اس میں سب سے پہلے اپنی فرصت اور رخصت تلاش کرے گا۔ پھر اس کا جو نتیجہ ہو گا وہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ تاہم یہ کافی طویل بحث ہے، یہاں نہیں سما سکتی۔

سی آئی ڈی کی ناقص معلومات واطلاعات

۱۹۷۱ء میں جب میں صدر بنا تو مرکزی سی آئی ڈی کے ایک سربراہ رضوی صاحب میرے پاس اچانک آ گئے۔ ان کے ساتھ انتخابات کے دوران آزاد کشمیر کی سیاسیات میں منفی و تخریبی فکر رکھنے والوں کے بارے میں اختلاف رائے تھا۔ وہ اپنے ماحول کی وجہ سے یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ الحاق پاکستان کے علاوہ جو نعرے لگتے ہیں وہ کتنے مضر ہیں اور وہ دشمن کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔ اس پر کافی تلخی تھی۔ میں اس سلسلہ میں کھلے بندوں ان کے خلاف بات کرتا تھا۔ ملے تو کہنے لگے "ایک تو میں ریٹائر ہو رہا ہوں اس لئے بھی ملنا چاہتا تھا دوسرے اس لئے کہ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اس معاملہ میں آپ کی اطلاع ٹھیک تھی، میری غلط تھی"۔

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے مگر مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ ہماری اطلاعات کا روز اول سے ہی کیا حال رہا ہے۔ ایک تو خبریں غلط، دوسرے ملازمین کی پسند و ناپسند کا بھی اس میں کافی دخل، تیسرے یہ کہ بنیادی اطلاعات مہیا کرنے والے عام طور پر نیم خواندہ چھوٹے ملازم ہوتے ہیں جن بے چاروں کی کچھ زیادہ فکری بساط و صلاحیت ہوتی ہی نہیں۔ چوتھے یہ کہ اگر "صاحب" کسی سے خوش ہو تو زمین و آسمان اس کے حق میں اور اگر خلاف ہو تو اس کے عین برعکس۔ پانچویں یہ کہ جن حکمرانوں کا براہ راست عوام کے ساتھ تعلق اور رابطہ نہیں ہوتا ان کو اطلاع دینے والے اکثر گھر بیٹھ کر ہی کارروائی کرتے رہتے ہیں۔ اس کا ایک بڑا مظاہرہ ہم مرحوم فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم اور بھٹو کے دور میں دیکھ چکے ہیں۔ پھر چھٹے یہ کہ ہماری سروسز میں بعض لوگوں کے مخصوص مفادات ہیں جس کی وجہ سے وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت محبّ وطن افراد کے مابین تلخی اور فساد کو قائم رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی کئی بار ثابت ہو چکی ہے۔ ساتویں یہ کہ ہمارے خلاف دوسرے ممالک کی سی آئی ڈی اور اس کی کارروائیوں کا بھی بہرحال اپنا ایک اثر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ آٹھویں یہ کہ کافی دیر سے ہمارے ہاں ملک، نظریہ اور اسلام کے ساتھ وفاداری کا شعور بھی اور معنی بھی بدل دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص منافقت سے ہی سہی، کسی وقتی حکومت کی وفاداری کا اظہار کرتا ہے تو وہی عین محبّ وطن اور اسلام پسند ہے۔ ورنہ وہ غدّار، تخریب پسند، شرپسند اور نہ جانے کیا کیا

Marfat.com

ہے۔ نویں یہ کہ نا اہل حکمران اپنے خلاف کوئی بات سن نہیں سکتے نہ ان میں اصلاح کی صلاحیت ہوتی ہے نہ خواہش۔ اس سے بھی وہی نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ دسویں یہ کہ ملک کے سیاسی کارکنوں کی کردار کشی اب ہماری قومی زندگی کا ایک ایسا جزو بنتی جا رہی ہے جس میں جائز و ناجائز کی قطعاً کوئی تمیز نہیں رہی۔ یہ اور اس قسم کی کئی دوسری باتیں مل کر ایک ایسا ملغوبہ بن گیا ہے کہ اس میں کسی بھی شے کے پورے اور صحیح خدوخال دریافت کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

وارنٹ میں تصحیح

۱۹۷۵ء میں جب مجھے گھر پر نظر بند کیا گیا تھا تو آزاد کشمیر کا ایک ڈی آئی جی میرا وارنٹ لے کر آیا۔ میں نے خلاف عادت اس کو پڑھا۔ پھر اس کو دے دیا اور کہا کہ وہ اسے لے جا کر ایک اور ڈی آئی جی' دلائی کیمپ کے کمانڈر میجر اورنگ زیب کو دکھائے۔ اگر وہ کہے کہ یہی عبارت ٹھیک ہے تو پھر میرے پاس لے آئے۔ میجر اورنگ زیب پاکستان آرمی کا افسر تھا اور ایک خاص مشن پر آزاد کشمیر بھیجا گیا تھا۔ جس مشن کا ایک حصہ دلائی کیمپ کی صورت میں روشناس ہوا۔ بایں ہمہ میرا یقین تھا کہ وہ اس وارنٹ کو واپس لے لے گا' وہی ہوا۔ میجر اورنگ زیب کو جب فون پر راولپنڈی میں اس وارنٹ کی عبارت پڑھ کر سنائی گئی تو اس نے "اپنی زبان" میں ان سے بات کی۔ پھر وہ وارنٹ تبدیل کر کے لائے۔ یعنی اس کی عبارت درست کر دی۔ بعد میں جب وہ میجر خود مجھے ملنے آیا تو پوچھا کہ پہلے وارنٹ میں کیا بات تھی۔ میں نے اسے کہا "دیکھو میجر صاحب! وہ وارنٹ تو ملک کے معروف دشمنوں اور غداروں کے لئے تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس کو رکھ لوں تو چلو میری تو کوئی بات نہیں ہے' اس کو محض اس حکومت کی نا اہلی پر محمول کروں گا مگر جوان لوگ اور بعد کے لوگ تو اس کو ان معنی میں نہیں لیں گے۔ یا وہ مجھے غدار ہی سمجھیں گے یا ان کا اعتقاد و اعتماد خود اس ملک اور نظریئے پر سے ہی اٹھ جائے گا" مجھے پہلے بھی کوئی زیادہ بد گمانی نہیں تھی مگر اس وقت مجھے خان عبدالولی خان کی حب الوطنی اور جرأت مندی کا اور بھی احساس ہوا جو انہوں نے اس آگ کو بجھانے میں دکھائی تھی جو راولپنڈی لیاقت باغ کے جلسہ میں لگائی گئی تھی اور جس کو اگر وہ نہ بجھاتے یا اس کو ہوا دیتے تو معلوم نہیں یہ ملک کس قیامت سے گزرتا۔ بدقسمتی سے ان کی سیاسی فکر کے ساتھ اتفاق نہیں ہو سکتا جس کا اظہار میں نے ان کے ساتھ اپنی آخری اور طویل ملاقات میں کیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انہوں نے پوچھا "تو پھر کیا کریں" میں نے کہا "خان صاحب! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور کرنا چاہئے یا ہمارے ساتھ چلیں یا ہمیں اپنے ساتھ لے کر چلیں" کیونکہ میرے خیال میں ان کی سیاست ان دونوں باتوں سے عاری ہے۔ واللہ اعلم۔

Marfat.com

مرکزی حکومت کی بوالعجبیاں

مرکزی حکومت کی جانب سے کئے جانے والے آئے دن کے پے در پے کئی واقعات ہیں جن کے باعث ہماری جوان سال نسل جو پہلے ہی بہت بے یقینی اور تذبذب کا شکار ہے ان اقدامات کے ردِّ عمل سے مزید متاثر ہوتی رہتی ہے اور اعتماد کا خلا بڑھ رہا ہے۔ مجھے شدّت سے احساس ہے کہ ہماری نظریاتی اساس کو اس سے بے حد نقصان ہو رہا ہے کیونکہ ایک عام ذہن تو بہرحال کسی صورت بھی حکومت اور ریاست کو از خود علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا بلکہ ہمارے ہاں تو خواص بھی ریاست اور حکومت میں کچھ زیادہ تمیز کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہماری حکومتیں بھی' جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں اپنے ساتھ وفاداری کو ہی ملک و ملت اور ریاست کے ساتھ وفاداری کا غلط اصول اپنائے ہوئے ہیں' تاہم یہ ذہنی انحطاط صرف جوان نسل پر ہی موقوف نہیں بلکہ اس کا اثر دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بھٹو صاحب کی صدارت میں کشمیری رہنماؤں کا جو اعلیٰ سطح کا اجلاس منعقد ہوا تھا اور جس میں ان کے کئی وزراء بھی شریک تھے' اس میں ایک بڑے قانون دان وزیر نے بہت زور دے کر کہا تھا"چونکہ مستقبل قریب یعنی آئندہ دس پندرہ سال تک کشمیر کا کوئی فیصلہ متوقع نہیں ہے اور اس اثناء میں آزاد کشمیر میں جو علیحدگی کی تحریک ہے وہ نوجوانوں کو بری طرح متاثر کر رہی ہے' اس لئے مناسب یہی ہے کہ آزاد کشمیر کو ہی پاکستان میں شامل کر لیا جائے" اس بات کے بارے میں کسی دوسری جگہ تفصیل سے ذکر کروں گا۔ یہی بات بدقسمتی سے الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ اس دور کی پارلیمینٹ میں بھی ایک معزز ممبر نے جو تحریک پاکستان کے ایک معروف رہنما بھی تھے' کہی تھی اور آج کل بھی بعض صحافی دوستوں کے قلم سے اس "بدترین مایوسی" کو ہی قوم کی مشکلات کا حل بتایا جا رہا ہے۔
یا للعجب!

بھارتی اسلحہ کی در آمد

۱۹۷۵ء میں میری گرفتاری کے دوران راولپنڈی سے اچھی خاصی مقدار میں بھارتی اسلحہ سرکاری گاڑیوں پر مظفر آباد لایا جا رہا تھا تا کہ ہمارے خلاف بھارت کا ایجنٹ ہونے کا کیس بنایا جائے۔ اسی طرح میری صدارت کے دوران بھی ہمارے ایک متشرع چیف سیکرٹری نے مرکزی حکومت کو خبردار کیا تھا کہ سردار قیوم اپنے علاقہ میں یعنی تھانہ دھیر کوٹ سے متعلقہ علاقہ میں اسلحہ جمع کر رہا ہے تا کہ پیپلز پارٹی اور اس کی حکومت کے خلاف مسلح جنگ کی جائے۔ چنانچہ سراغرسانی کی تمام ایجنسیوں نے اس علاقہ پر یکبارگی ہلّہ بول دیا اور چپّہ چپّہ چھان مارا مگر افسوس ہے کہ ایسی سنسنی خیز اور غلط اطلاع دینے والوں سے کسی نے پوچھا تک نہیں کہ انہوں نے یہ کیا کیا۔ پوچھنا تو درکنار مجھے خیال تھا کہ ایسے لوگوں کی ترقیاں متوقع ہوں گی

Marfat.com

کیونکہ ہمارے ہاں یہی ہوتا رہا، جو گھر لیٹا رہا اور محاذ کی شکل تک نہیں دیکھی، وہ بھی بہادری کے بڑے بڑے انعامات سے سرفراز ہوا اور جو کسی مہم سے ناکام ہو کر آ گیا تو اس کی ترقی تو بالکل یقینی امر۔ ہمارا روزمرّہ یہی رہا ہے۔

ہر کشمیری محبّ وطن ہے

ایک اور واقعہ کا ذکر بھی ضروری ہے وہ یہ کہ جب ہم ۱۹۷۱ء والے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف تھے تو میں ایک روز وزارت امور کشمیر کے دفتر گیا۔ اس وقت سیکرٹری تھے موسیٰ احمد صاحب، خدا ان کو خوش رکھے، دفتر کے ایک کونے میں پڑے ہوئے فائلوں کے انبار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "معلوم ہے یہ کیا ہے؟" مجھے کیا معلوم میں نے جواب دیا۔ کہنے لگے "یہ کشمیری لیڈروں کا وہ ریکارڈ ہے جس کے مطابق تمام کشمیری لیڈر غدار ہیں چنانچہ انہوں نے کہا۔ "میں نے حکم دیا ہے کہ یہ سب فائلیں ہماری وزارت سے واپس اپنے محکمہ کو بھیج دو ہمارے نزدیک ہر کشمیری محب وطن ہے" غالباً ایسے ہی چند افراد کے باعث یہ ملک چل رہا ہے۔

غلط فہمیاں اور بدگمانیاں

غلط فہمیوں یا بدگمانیوں کا دائرہ کچھ کم وسیع نہیں ہے۔ چند سال پیشتر ہم لوگ حج پر تھے۔ میرے محترم بھائی مولانا ظفر احمد انصاری جیسے باخبر، صاحب علم و فہم شخص نے مجھ سے خاص طور پر علیحدگی میں کہا "آپ نے جنگ اخبار پڑھا ہے"۔ نہیں "میں نے کہا "کیوں" کہنے لگے "اس میں کوئی خبر تھی کہ ایف ایس ایف نے سردار قیوم کو کوئی رقم دی تھی" میں نے حسب عادت اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر دوسرے چند ساتھیوں سے پوچھا جو اخبارات باقاعدہ پڑھتے ہیں جب کسی نے تصدیق نہ کی تو پھر مولانا سے پوچھا کہ کیا وہ اخبار انہوں نے خود پڑھا تھا۔ تو انہوں نے بتایا کہ ان کو بھی کسی نے سنایا تھا۔ اس خبر پر ہی کیا موقوف تھا، ہمارے ملک کے سربراہ خود بعض ذمہ دار حضرات سے فرماتے رہے کہ سردار قیوم نے حکومت کے دوران خدا جانے کیا کیا بدعنوانیاں کی ہیں جن کی بناء پر میرے خلاف محاسبہ کا مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

ایف ایس ایف کی بات سے یاد آیا کہ جب ہم نے ۱۹۷۵ء میں انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تو ہماری کئی بقیہ ذمہ داریوں میں سے ایک نازک تر ذمہ داری یہ تھی کہ جس جلسہ سے میں خطاب کرنے مظفر آباد جا

Marfat.com

رہا تھا اور ایف ایس ایف نے دلائی سے واپس کر دیا تھا اسی دن اس جلسہ میں لگائے ہوئے شامیانے دریاں اور کرسیاں وغیرہ اسی نیم فوجی تنظیم "ایف ایس ایف" نے مقامی انتظامیہ کے ساتھ مل کر سب جلوا دیئے تھے۔ ان کا مالک میرے پاس آیا اور اپنے نقصان کا مطالبہ کیا۔ ہم اس وقت بیس پچیس ہزار روپے کہاں سے لاتے۔ میں نے کچھ مہلت چاہی اس پر وہ بے چارہ رضامند ہو گیا۔ چند دن غور کرنے کے بعد میں نے کسی زیادہ تامل کے بغیر ایف ایس ایف کے چیف مسعود محمود کو فون کیا۔ وہ گفتگو بھی دلچسپ تھی۔ کہنے لگے "کیسے آپ نے یاد کیا" میں نے کہا "مجبوری سے۔ وہ آپ کو یاد ہے جو مظفر آباد میں آپ نے ہمارے شامیانے جلوائے تھے؟" کہنے لگے "بالکل یاد ہے۔ ہم نے جلوائے تھے" میں نے کہا "وہ مالک نہ کشمیری ہے نہ مسلم کانفرنسی' ایک عام پاکستانی تاجر ہے اور ہمارے پاس کوئی پیسہ وغیرہ نہیں ہے۔ آپ کے علم میں ہے اس غریب کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں" مسعود نے ہنس کر کہا "اچھا ہوا' اسی بہانے آپ نے یاد تو کیا۔ مجھے چند دن دیجئے" پھر کچھ دنوں بعد اس کا فون آیا تو پوچھا کہ وہ شامیانے والا میرے پاس آیا ہے یا نہیں۔ وہ ابھی نہیں ملا تھا۔ کہنے لگا "میں نے اس کا ایک ایک پیسہ ادا کر دیا ہے" یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اس کو کتنی رقم ملی لیکن اگر ایف ایس ایف والوں نے اس کو دو لاکھ یا جس قدر رقم ان کا دل چاہا' دی ہو یا وصول کر لی ہو اور کاغذات میں وہ سب رقم میرے نام کر دی ہو تو میں اس کا کیا علاج کر سکتا ہوں۔ اس بات کا جہاں ایک مضر پہلو ہے' وہاں یہ بات بھی تو تھی کہ تلخی صرف سیاست کی حد تک تھی کم از کم میرے ساتھ' ہم میں سے کس کو معلوم نہیں ہے کہ کشمیر کے نام پر جو کروڑوں روپیہ مرکزی خزانہ سے خرچ ہوتا ہے اس کا بیشتر حصہ کہاں خرد برد ہوتا ہے۔ کوئی ایسا قابل ذکر کشمیری نہ ہوگا جس کے نام کا کھاتہ نہ کھلا ہوا ہو' خواہ اس کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ ہو۔ اس طرح اگر کوئی شخص اس سرکاری ریکارڈ کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لے تو ظاہر ہے کہ وہ بہت حد تک خود فریبی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

محکمہ سراغرسانی کے کارنامے

میرے ساتھ تو سرکاری مشینری اس بارے میں خاص طور پر مہربان رہی ہے۔ انہوں نے نہ مجھے اچھا ظاہر کرنے میں بخل کیا نہ برا کہنے میں۔ ۱۹۶۹ء کے دوران کسی معاملہ میں آئی ایس آئی کے سربراہ میجر جنرل محمد اکبر خان مرحوم کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔ بات آزاد کشمیر میں حکومت کی تبدیلی اور انتخابات وغیرہ کی تھی دوسری باتوں کے علاوہ جب میں نے محسوس کیا کہ یہ شخص یقین والا اور راست گو ہے تو میں نے ان سے کہا کہ "اگر میرے بارے میں کوئی مخالفانہ رپورٹ ہو تو آپ مجھ سے پوچھ لیں۔ قبل اس کے کہ اس پر کوئی رائے قائم کریں"۔ اس کا کیا فائدہ ؟ انہوں نے پوچھا۔ میں نے کہا کہ "آج

Marfat.com

کل بالعموم میرے خلاف رپورٹیں ہو رہی ہیں کیونکہ سراغرساں محکمہ میں کچھ لوگ اس پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے اگر وہ بات درست ہوگی تو میں اسے تسلیم کروں گا اور غلط ہوگی تو اس سے جو پریشانی ہوگی اور حکومت جو غلط اقدام کرے گی وہ بچ جائے گا"۔ انہی دنوں میں صدر یحییٰ خان اور وزارت امور کشمیر کے سیکرٹری موسیٰ احمد صاحب کے ساتھ ایسے ہی دو واقعے ہو چکے تھے اور میں تو اب اس کارروائی کا بخوبی واقف تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد جنرل اکبر خان نے مجھے بلایا۔ کہنے لگے آپ کے خلاف بڑی سنگین رپورٹ ہے کہ بعض جرنیلوں کے ساتھ مل کر یحییٰ خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے ہیں۔" میں نے ان سے کہا "دیکھئے اسی کو ایک آزمائشی مسئلہ بناتے ہیں۔ ایسا کریں کہ میں ایک کاغذ پر یہ رپورٹ کرنے والے اور اس کے جو آگے خفیہ اطلاعات دینے والے ہوتے ہیں ان کے نام درج کرتا ہوں اور لفافہ کو مہر لگا کر آپ کے پاس رکھ دیتے ہیں اس کو ایک ساتھ کھولیں گے۔ اس اثنا میں آپ چند باتیں دریافت کر لیں، وہ یہ کہ یہ جرنیل صاحبان تو کوئی عام آدمی نہیں ہوتے ان کی نقل و حرکت سب ریکارڈ پر ہوتی ہے یہ معلوم کریں کہ اس خاص دن جس کا ذکر ہے یہ لوگ کہاں کہاں تھے اور میں کہاں تھا دوسرے یہ معلوم کریں کہ آیا ان میں سے میری کسی سے کوئی بھی واقفیت یا علیک سلیک ہے یا کبھی ملاقات بھی ہوئی ہے پھر مجھے بلائیں تب مزید باتیں کریں گے" چند دنوں بعد پھر ان کا فون آیا۔ میں ملا تو کہنے لگے "وہ دو باتیں تو آپ کی بالکل درست ہیں" میں نے کہا "اب وہ لفافہ کھولئے"۔ وہ پڑھ کر کچھ حیران سے ہو گئے کہنے لگے "رپورٹ کرنے والے لوگ تو بالکل یہی ہیں"۔ میں نے کہا اگر محض اتفاقیہ یہ بات نہ ہوتی تو آپ نے تو رپورٹ کر دینا تھی۔ کوئی ثبوت نہ بھی ملتا' تب بھی وہ جرنیل بے چارے تو بے گناہ مارے گئے تھے اور یحییٰ خان مجھے بھی 'کیا پتہ' کہتے کہ اس کو پھانسی لگا دو" بات صرف یہ تھی کہ وہ افسر لوگ آزاد کشمیر میں کسی ایک صاحب کو کسی خاص وجہ سے صدر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مجھے راستہ سے ہٹانے کا یہی موزوں اور آسان طریقہ دریافت کیا گیا۔ لیکن اس واقعہ سے ان کا پول بھی کھل گیا اور اکبر خان مرحوم کے ساتھ بھی آخری دم تک مودّت اور باہمی اعتماد کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم رہا۔ رضوی صاحب جو معافی مانگنے آئے تھے تو اس میں بھی ایک بات یہی تھی اس ضمن میں مجھ پر جو گزری ہے اور جس مشقّت سے مجھے گزرنا پڑا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے میں ابھی تک زندہ ہوں یہ خدا کی کسی خاص کرم نوازی سے خالی نہیں ہے۔ اس پر علیحدہ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

جسے اللہ رکھے

ان لوگوں نے کچھ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ۱۹۵۲ء میں جب میں وزیر تھا تو ایسے ہی کچھ لوگوں نے لیاقت باغ میں ہونے والے ایک جلسہ میں میری شرکت پر بہت اصرار کیا۔ میں نے اتفاق کر لیا۔

Marfat.com

جس دن شام کو جلسہ تھا، میں حسب معمول اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اجازت کے لئے حاضر ہوا۔ وہ ان دنوں مری میں قیام پذیر تھے۔ اجازت تو در کنار ان کے ساتھ ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ تاوقتیکہ جلسہ کا وقت گزر گیا۔ مجھے وعدہ خلافی اور ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرنے کے خیال سے بہت بے چینی اور پریشانی تھی۔ عشاء کے وقت مجھے حضرت نے یاد فرمایا۔ فرمانے لگے "وہ جلسہ کیا ہوا" میں نے کہا "میں نہ جاسکا" فرمانے لگے "اچھا ہوا، وہاں وہ لیاقت علی خان والی بات تھی" مجھے صدمہ بھی ہوا کہ ایسا کیوں ہوا اور تردّد بھی ہوا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر ان کی بات کو غلط بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تو ہمارے ایک عزیز جو ابھی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں، بڑی پریشانی میں آئے۔ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے کہ ان دنوں میں کوئی بڑا جلسہ ہو گا آپ نے وہاں نہیں جانا۔ مجھے فلاں شخص نے (جو سی آئی ڈی کا ایک بڑا افسر تھا) بتایا ہے کہ وہاں آپ کو گولی مارنے کا منصوبہ ہے۔ یہ بھی کوئی بہت واضح ثبوت نہیں تھا۔ چھ دن اور گزرے تو وہ شخص جس کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا اور ہمارا اقربی تھا، مگر کسی وجہ سے بہت ناراض تھا، خود بخود آیا اور وہ پستول اور گولیاں میرے حوالے کیں کہ یہ وہ کام ہے جو میرے سپرد کیا گیا تھا، خاص کر اس جلسے میں جو لیاقت باغ میں ہونے والا تھا۔ یہ بھی کوئی ایک ہی واقعہ نہیں ہے کہ اس پر بس ہو گئی ہو صرف مثال کے لئے سر دست یہی کافی ہے۔ مجھے اس ملک کے ایک انتہائی منظم گروہ کے نمائندوں نے سامنے کھڑے ہو کر کہا "اچھا، تم نے ہماری بات نہیں مانی، اب بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔ پھر بھی الحمدللہ میں زندہ و سلامت ہوں اور جو کچھ بھی ہوں وہ ہوں۔

تالیف قلوب یا ضمیروں کے سودے

خرید و فروخت اور تالیف قلوب کے بارے میں حکومتوں کا طرز عمل کوئی نیا نہیں ہے البتہ مختلف حکومتیں اپنے حکمرانوں کے مزاج کے مطابق اس پر عمل کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں تو یہ ایک بالکل علیحدہ سائنس وجود میں آ گئی ہے جس کے لئے باقاعدہ شعبے قائم ہو گئے ہیں جو ملک جتنا ترقی یافتہ ہے وہاں یہ فن بھی اتنا ہی ترقی یافتہ ہے۔ ذرائع تقریباً وہی ہیں مگر ان کا استعمال بہت حکیمانہ (سائنٹیفک) ہو گیا ہے۔ وہ ذرائع جن سے دوسرے کی رائے متاثر کی جاتی ہے، غالباً تین ہیں۔ اس سلسلے میں سی آئی اے کی عورتیں تو خاصی شہرت یافتہ ہیں۔ صنف نازک کو تقریباً ہر زمانے میں اس میدان میں کام میں لایا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان میں تو اس کا اپنا ایک خاص رواج اور طریقہ رہا ہے خاص کر سیاست میں تو کچھ بڑے کارنامے اسی ذریعہ سے سرانجام دیئے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ریڈ کلف ایوارڈ تک میں بھی اسی عنصر کا خاصا دخل تھا۔ بعض ہندوؤں اور یہودیوں کے ہاں تو اس کو مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ فلسطین سے مسلمانوں کو قانوناً بے دخل کرنے کے لئے اس ذریعہ کو کس طرح منظم کر کے کام میں لایا گیا، میں نے خود اس کا مشاہدہ

Marfat.com

کیا۔ سابقہ دور حکومت میں میرے خلاف آپ کے کچھ رفیقوں کے ذریعہ ایسی ہی ایک سازش کی گئی تھی اگرچہ اس کا مقصد محض مجھے رسوا کرنا تھا۔ وہ تو آخری مرحلہ میں خود بخود ''واللہ خیر الماکرین'' کی نذر ہو گئی۔ بلکہ میرے خدا نے ان افراد کو بھی کہیں کا نہ چھوڑا۔ میں تو بچ گیا البتہ اس ذریعہ کو چونکہ جنس لطیف کا تحفظ حاصل ہے اس لئے اس کا نہ تو ذکر ہوتا ہے نہ اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ یعنی پردہ نشینی تو نہیں مگر پردہ پوشی کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ ذریعہ بھی خاصا مؤثر ثابت ہوا ہے۔

دوسرے درجے میں یا درمیان میں روپیہ پیسہ کی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم بلاواسطہ بھی اور بالواسطہ بھی اپنی کئی مختلف صورتوں اور شکلوں میں کارفرما رہتی ہے۔ بالواسطہ سے مراد کئی شکلیں ہیں مثلاً اگر کوئی شخص خود کچھ نہیں لیتا تو اس کے قریب ترین معتمدین کو دیا جاتا ہے۔ اگر وہاں بھی کوئی مناسب شخص نہ ملے تو پھر تیسرے درجے کے لوگوں سے کام لیتے ہیں تا کہ وہ ان معتمدین کی رائے کو متاثر کریں جو آگے اصل آدمی کی رائے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ میں اپنے ارد گرد بھی دور دور تک کسی روپے کا کوئی اثر نہیں دیکھتا کہ جس سے شک ہو، معاملہ تیسرے درجے کا ہے تو میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اس درجے میں کوئی قابل ذکر مقدار بھی صرف نہیں ہوتی۔ غالباً اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تیسرا سب سے مؤثر ذریعہ خود کار حکومت میں کسی کو شریک کرنے کا لالچ دینا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میں نے اپنے بارے میں کافی باتیں کہہ دی ہیں جن سے کوئی بھی عاقل اور انصاف پسند انسان کافی کچھ سمجھ سکتا ہے جو اس کے اصل مخاطب ہیں۔

جبر و تشدد اور صبر و استقامت

لوگوں کی رائے تبدیل کرنے یا متاثر کرنے کا ایک چوتھا ذریعہ بھی ہے اور وہ خوف و ڈر ہے۔ کسی کو مروا ڈالنا، اس کے ذرائع تنگ کر دینا اور قید و بند میں ڈال دینا ہے۔ اس آزمائش میں تو پھر ہر شخص کا حوصلہ اس کے مقاصد کے اعتبار سے ہی ناپا تولا جا سکتا ہے۔ ان مقاصد کے ساتھ اس کی لگن اور اس کا قلبی تعلق کتنا ہے۔ یہ زیادہ معتبر ہو جاتا ہے۔ زندگی کا یہ بھی عجیب پہلو ہے اس میں اچھے یا برے مقاصد کا بھی کوئی فرق نہیں ہے کوئی بھی شخص جس چیز کو اپنا مقصد سمجھتا ہے اس کے لئے وہی اچھا ہے۔ تاہم ایک نقطۂ نظر سے حضرت احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا خلق قرآن والا واقعہ کیسا رہنما اصول ہے۔ حضرت امامؒ کو تقویت بھی ملتی ہے تو ایک ڈاکو سے۔ اسی مثال کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم اپنے ارد گرد دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ہمارے نقطۂ نظر کے لحاظ سے بالکل فضول بلکہ بعض اوقات لغو مقاصد کے لئے جانیں دے دیں اور بعض نے زندگیاں قید خانوں کی نذر کر دیں۔ میں نے ۱۹۷۶ء میں پڑھا تھا کہ جرمنی میں ایک کمیونسٹ پچیس سال کی سزا کاٹ کر رہا ہوا اس کے مقابل جن لوگوں کا کوئی نیک مقصد

Marfat.com

ہو جس میں خدا اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خوشنودی مقصود ہو' یا کم سے کم اپنی زندگی میں ان پر ایمان ہی رکھتے ہوں تو وہ اس بات کے بدرجہا زیادہ مستحق ہیں کہ تکلیفیں اٹھائیں اور صبر کریں۔ اگرچہ میرے خیال میں کسی بڑے مقصد کے لئے تکلیف یا مشقت اٹھانا نسبتاً بہت آسان ہے کیونکہ وہ اپنے نفس کی خواہش کی پیروی میں ہے اور نفس اپنے مرغوب کے ساتھ خوش رہتا ہے جب کہ نیک مقاصد میں خود نفس ہی سب سے زیادہ مخالفت کرتا ہے اور مشقت برداشت کرنے میں ساتھ نہیں دیتا تاہم کسی قسم کا یقین رکھنے والے لوگوں کے لئے بالعموم اور خدا پر یقین رکھنے والوں کے لئے بالخصوص کوئی ڈر یا خوف نہیں ہونا چاہئے۔ خدا کا وہ وعدہ برحق ہے کہ "وَاَنتُمُ الاَعلَونَ اِن کُنتُم مُّؤمِنِینَ" مجھے مہاتما گاندھی کی ایک کتاب کا تمہیدی جملہ یاد ہے اگرچہ میں نے اس کے علاوہ اس کتاب میں سے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اسی پر میرے ایمان اور سوئے ہوئے ضمیر کو ایسی مہمیز ہوئی تھی کہ باقی کتاب غیر ضروری ہو گئی تھی۔ گاندھی کہتے ہیں کہ "انسان کا سب سے بڑا دشمن خوف و ڈر ہے مگر جس کو خدا پر کوئی بھی یقین ہے اس کو کوئی ڈر یا خوف نہیں ہے"۔

مروجہ سیاسی نظام

ان معاملات کو سمجھنے کے لئے اپنے مروّجہ سیاسی نظام کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہئے۔ سیاست پر قبضہ سیاستدانوں کا ہو یا غیر سیاستدانوں کا' یہ امر زیادہ اہم نہیں ہے کیونکہ وہ خدوخال جن پر کوئی بھی ڈھانچہ مرتب ہوتا ہے بدستور باقی رہتے ہیں۔ بنیادی بات وہ افراد ہیں جو کسی بھی ڈھانچہ کو چلا رہے ہوں۔ بنیاد ہے ان کا کردار اور طریق کار' نیز ان کی اساسی فکر۔ اگرچہ سیاسی نظام کی بنیاد تو نظریات' عقائد اور جماعتیں مع اپنے منشور کے ہونی چاہئیں' مگر ہمارے ہاں خاص طور پر اس نظام کی بنیاد محض افراد ہیں۔ سیاسی نظام سے ہی واضح ہو گا کہ ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم اصل میں ہیں کیا' ہم میں کون کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔ خود اسلام کو جن امور نے ساری کائنات میں ممتاز کیا ان میں سیاسی نظام اور اس کے چلانے والے مبارک افراد کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ تاریخ اس کی ناقابل تردید گواہ ہے۔ اگرچہ اسلام کی بنیاد کسی سیاسی مصلحت یا تقاضے پر قطعاً نہیں ہے۔ کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں بھی معاذ اللہ ان لوگوں کی طرح ہوں جن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی اصل اور بڑی حیثیت ایک سیاسی حکمران کی سی ہے۔

سیاسی اصطلاحات کی رو سے ہم بھی ایک آزاد قوم ہیں' جمہوریت چاہتے ہیں' اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔ اور اب خدا کے فضل و کرم سے ہم محض ایک مسلمان ملک سے ترقی کر کے ایک اسلامی جمہوری ملک بھی کہلانے کے خواہش مند ہیں۔ ہیں تو بھی کچھ مگر پتہ نہیں کہ صحیح طور پر "وہ" ہیں بھی یا نہیں۔

ہمارے ہاں سیاست پر زیادہ اثر افراد کا ہی رہا ہے۔ اس سے ہٹ کر ہماری سیاست کی بنیاد کسی

Marfat.com

عقیدے، نظریئے یا جماعت کے بجائے شخصی مفادات، ذاتی مصلحت رقابت پر رہی ہے جو امراء کا ایک مشغلہ رہا ہے۔ کچھ لوگ سیاست میں محض اس لئے ہیں کہ وہ بہر صورت حکومت چاہتے ہیں کیونکہ ذاتی مفادات حاصل کرنے کا وہی افضل ترین ذریعہ ہے۔ کچھ لوگ اپنے مفادات کی ترقی اور تحفظ کی وجہ سے مجبور ہیں کہ سیاست میں ہوں اور ضرورت ہو تو مصالحت بھی کر لیں۔ کچھ لوگوں کی مجبوری ان کی شخصی، قبیلائی، علاقائی، لسانی یا مذہبی رقابتیں ہیں۔ مگر ایک بات جو ان سب میں قدر مشترک ہے اور پوری سیاست کی بنیاد ہے وہ یہ ہے کہ لباس کوئی بھی ہو مگر اس کے پہننے کا مستحق صرف ایک "دار" ہی ہو سکتا ہے۔ وہ سرمایہ دار ہونا چاہئے، چاہے جاگیر دار ہو، کارخانہ دار ہو یا ان کا کوئی ایجنٹ ہو۔ اس کے باہر ہمارے ہاں ہی کیا کسی بھی ملک میں، سیاسیات میں کسی اور کا دخل تقریباً ناممکن ہے یا محض حادثہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو کسی نظریئے، منشور یا ملکی و قومی مفادات کی بنیاد پر سیاست میں اپنا قیمتی سرمایہ، جان و دل اور وقت صرف کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک بنیادی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں مل بیٹھنے کا رواج کم ہو رہا ہے۔ کیونکہ مفادات کا تو ہر صورت تصادم ہوتا ہے۔ اس میں باپ بیٹے کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ تاہم جب سیاست کی بنیاد ان امور پر ہو تو پھر بے چاری آزادی، جمہوریت، ملک حتیٰ کہ مذہب بھی محض آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں" مقصود نہیں رہتے۔

بے بس اکثریت میں شعور آزادی

کچھ دوستوں کو ناگوار تو ہوگا مگر کسی حقیقت کے اعتراف کے لئے عذر خواہی کی ضرورت نہیں ہے کہ تحریک پاکستان کے اختتام یعنی قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ بھٹو صاحب نے اس ملک میں ایک نظریئے اور جماعت کی سیاست کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ وہ بھی تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے "داروں" کے اسی غیر محسوس نظام کے شکنجے میں پھنس گئے پھر بھی یہ بھٹو ہی تھے جنہوں نے اس ملک کی غالب اکثریت کو جس کو امریکہ کا ایک سابق صدر رچرڈ نکسن "مجبور یا بے بس اکثریت" کہتا ہے، اس کا حق دلوانے کا شعور اور احساس پیدا کیا۔ ایک عام آدمی نے اسی دور میں پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا تھا کہ یہ ملک "پاکستان" اس کا بھی ہے اور اس پر اس کا بھی حق ہے۔ غالباً یہ وہی بے بس اکثریت ہے جس کے خوف سے اب تک انتخابات نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اب تو کہا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کو ووٹ کا ابھی شعور نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جس باپ نے بڑی مشقت سے اولاد کو پڑھا لکھا کر بڑا کیا ہو، وہ جب بڑے ہو جائیں تو اسی باپ کے متعلق فتویٰ دیں کہ یہ تو بے شعور ہے۔ اس طرح گویا ووٹ کا حق اس کو ہونا چاہئے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنی رائے کا تعین ہی نہیں کر سکتا اور جس کی رائے کو راستے میں درجن بار متاثر کیا جاتا ہے یا کم سے کم یہ کہ وہ اپنے شعور کا تعین اپنے ذاتی مفادات کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے اور انتخابات میں

Marfat.com

ایک منڈی لگا لیتا ہے۔

اپنی رائے تو اصل میں اسی بے بس اکثریت کی ہوتی ہے البتہ وہ اس کا اظہار ہر وقت نہیں کر سکتی۔ اسی لئے کہ وہ بے بس ہے، نہ وہ لوگ روز روز جلسے جلوس کر سکتے ہیں نہ وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر قید خانوں کی رونق بڑھا سکتے ہیں۔ ان کو روز مرہ سے فرصت کب ملتی ہے اور فراغت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اس کا اظہار وہ لوگ وقت آنے پر ووٹ کی صورت میں کرتے ہیں ان معنوں میں ان کا بے شعور ہونے کی اصل یہ ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے کیوں ووٹ دیں۔

یہ بھٹو ہی تھے جنہوں نے متوسط طبقہ کے افراد کو حکومت کے ان ایوانوں تک پہنچایا جہاں ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جہاں سوٹ بوٹ کے بغیر داخل ہونا ایک بڑا اخلاقی جرم تھا۔ جو لوگ عمر بھر میں مشکل سے کسی لوکل کمیٹی کے ممبر ہو سکتے تھے۔ بھٹو نے ان کو صوبائی اور مرکزی وزارتوں میں بٹھایا۔ مگر افسوس ہے کہ نہ تو انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا نہ ان کو وہ فضا ہی راس آئی۔ نہ انہوں نے محنت کر کے خود کو اس قابل بنانے کی فکر کی۔ انہوں نے سمجھا کہ پہلے یہ سرمایہ داروں کی وراثت تھی، اب ہماری ہے۔ چنانچہ ان کی بہت سی واہی تباہی ایسی تھی جو بھٹو کے کھاتے میں پڑ گئی۔ اس بے بس اکثریت کی بے بسی اس حد تک تو قائم رہی کہ قیادت پہلے بھی ان غیروں کے ہاتھ میں تھی اور اب بھی ایک دوسرے لحاظ سے غیر ہی اس پر مسلط ہو گئے۔ ان لوگوں نے تو حکومت کے مقدس مشن کو ایک بازاری کام اور رقص ابلیس بنا کر رکھ دیا تھا جس کی سزا وہ بھی اور یہ ملک بھی، دونوں بھگت رہے ہیں اور نامعلوم کب تک بھگتیں گے۔ مولانا! آپ کو یاد ہو گا میں اس دور میں بھی ان باتوں کی طرف توجہ دلاتا رہا مگر اس کے جواب میں الٹا میری مخالفت ہوتی رہی۔

زوالِ اقتدار کا اصل سبب

اسی "اکثریت" سے یاد آیا کہ تھوڑا عرصہ قبل اسلام آباد میں ایک سرکاری دعوت میں مجھے بھی یاد فرمایا گیا تھا۔ ایک صاحب جو واقف تھے (راجہ صاحب نہیں) وہ ان ہی دنوں وزیر بنے تھے۔ ان سے پوچھ بیٹھا کہ کیسا ہے کاروبار حکومت۔ کہنے لگے "لوگ بہت تنگ کرتے ہیں، درخواستیں لے کر آجاتے ہیں"۔ میں نے پوچھا "کتنے لوگ آتے ہیں"۔ میرا قیاس اپنی صدارت کے زمانے پر تھا۔ مگر ان کی بات سن کر حیران ہو گیا وہ کہنے لگے "کوئی چار پانچ روزانہ" میں نے مجبوراً کہہ دیا "بس؟" کہنے لگے "نہیں۔ بات تعداد کی نہیں ہے۔ میرا کام یہ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ" مجھے فوراً فیلڈ مارشل کا زمانہ اور اسلام آباد یاد آگیا میں نے کہا "یہ اسلام آباد جہاں ہم کھڑے ہیں مرحوم فیلڈ مارشل کا کتنا بڑا کارنامہ ہے"۔ کہنے لگے "ٹھیک ہے" میں نے کہا "پھر ان کا جو انجام ہوا وہ پتہ ہے کیوں ہوا؟" وہ چپ تھے۔

Marfat.com

نواب زادہ نصراللہ خان ٬مفتی محمود ٬بھٹو ٬کوثر نیازی اور عبدالحفیظ پیرزادہ

Marfat.com

میں نے کہا "صرف اس لئے کہ یہ چار پانچ آدمی جو روزانہ آپ کے پاس آتے ہیں، خوش نہیں تھے۔ اس تمام تعمیر و ترقی کا انہوں نے اعتراف نہ کیا نہ اس کو قبول کیا یہی وہ لوگ ہیں جو اس ملک کی اصل اساس ہیں اور اس کی سلامتی بقا اور استحکام کی ضمانت ہیں۔ اگر یہ خوش ہوں گے تو بھوکے رہ کر بھی اس ملک کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیں گے اور اگر یہ غیر مطمئن ہوں گے تو سب تعمیر و ترقی بے معنی ہو کر رہ جائے گی چنانچہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو بھٹو کے دور حکومت میں زندگی کا احساس ہونے لگا تھا اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کے باعث، باوجود اس تمام کچھ کے جو ہوا وہ لوگ ابھی تک بھٹو کے نام سے پیار کرتے ہیں۔ اس میں نہ کسی سوشلسٹ یا کمیونسٹ کا کمال ہے نہ کسی اور کا۔ اور کوئی دوسرا اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ بات اب ختم ہو جائے گی تا وقتیکہ اس کا عین بدل مہیا نہ ہو اس "بے بس" اکثریت کے اس لگاؤ کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

حکومتوں کے کرنے کا اصل کام

حکومتوں کے کرنے کا اصل کام یہی تھا کہ وہ اس ملک کے عوام الناس کو اپنائیت اور آزادی کا احساس دلاتے، کیونکہ اس احساس کے بغیر لوگوں کی حیثیت یا محض محکوم کی سی بن جاتی ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ خود غرض اور مفاد پرست کرایہ کشوں کی سی جو اپنے جذبۂ شوق اور ملک کے مفاد کی خاطر کام کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں جب وہ جانتے ہی نہ ہوں گے کہ آزادی کیا ہے تو اس کا تحفظ کیسے کریں گے۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں کہ ۱۹۴۷ء میں ہمارا جذبہ کیا تھا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں کیا تھا اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کیا صورت ہو گئی تھی۔ اگر خدا نخواستہ موجود حالت میں کوئی مصیبت آ جائے تو عوام النّاس کا ردِّ عمل کیا ہو گا؟ البتہ خداوند عالم تو بہر حال دلوں کو بدلنے پر قادر ہیں مگر یہ بات ہمارے اختیار میں تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی کام جس کے بغیر ہماری حکومتیں جو بھی کر رہی ہیں وہ سب کچھ کسی ایک ہی حادثے کی نذر ہو سکتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

عوام النّاس کو دوزخ اور جنت کی بات اتنی جلد سمجھ میں نہیں آتی ان کے نزدیک مذہب ہو نظریہ ہو یا ملک "ان کی اولین ترجیح تو ان کے مسائل کے حل کا نقطۂ نظر ہے کیا ہم روزانہ دیکھتے نہیں ہیں کہ عیسائی مشنری اور کئی دوسرے مذہبی گروہ کس طرح اسی انسانی کمزوری کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں مذہبی فتوے جس قدر جی چاہے ہم دیتے رہیں مگر عوام کی اس سوچ کو جو بالکل ایک فطری اور صحیح سوچ ہے، اس طرح نہ بنایا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے ۱۹۷۱ء کے قومی انتخابات میں کیا یہی نہیں ہوا فتوے سب ایک طرف دھرے رہ گئے اور لوگوں نے سمجھ میں آنے والی بات کو قبول کیا حالانکہ وہ بات بھی ابھی پوری طرح سب لوگوں تک پہنچی نہ تھی۔

Marfat.com

قرون اولیٰ میں اسلام کا طرّہ امتیاز یہی تھا کہ اس نے "بے بس" اکثریت کے مسائل کو اولیت دے کر حل کیا، ان کو اعلیٰ مقام دیا۔ اس پر ظلم کرنے والے ہاتھوں کو کمزور بلکہ مفلوج کر کے رکھ دیا اور یہ جو "فوج در فوج" لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔ (ترجمہ: اور آپ لوگوں کو فوج در فوج دین میں داخل ہوتے دیکھیں گے۔ تو کیا ان سب پر اچانک تمام غیبی امور آشکار ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا بلکہ بات وہی مسائل کی تھی۔ کالے اور گورے کا امتیاز ختم کر دیا گیا تھا۔ نسلی برتری کچھ نہ رہی تھی۔ حاکم و محکوم کا کوئی امتیاز نہ تھا اور ایسی مساوات تھی کہ اس کی کوئی نظیر دنیا کا کوئی نظام پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔ انسانی عزت و عظمت کا اعتراف کیا جا رہا تھا۔ لوگ خواہ کسی بھی معاشی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں ان کی جان، مال عزت و آبرو سب برابر اور مقدس تھی آج کل کے نظاموں کی طرح مصنوعی انداز مہیا نہیں بلکہ حقیقی طور پر طبقات کو ختم کر دیا تھا اس نظام نے کمزور کو طاقتور اور طاقتور کو کمزور کر دیا۔ یہ تھی وہ چند وجوہات جن کے باعث وہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔

تحریک پاکستان کی مقبولیت کا راز

خود تحریک پاکستان کا محرّک کوئی غیبی امر نہ تھا بلکہ بلا تامّل کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اساسی محرّک بھی وہی بنیادی انسانی مسائل کا آبرومندانہ حل اور انسانی زندگی کے احترام کی امید تھی جو متعصب ہندو اکثریت کے زیر سایہ ممکن نہیں تھی۔ جس کا تصوّر صرف اور صرف اسلام کے مقدس نظام زندگی میں ہی ممکن و متصور ہو سکتا ہے لیکن اب جب کہ یہاں سب کچھ اس کے عین برعکس ہو رہا ہے تو لوگ آئے دن سوال کرتے ہیں کہ یہ نظریہ پاکستان تھا کیا؟ ہمارے مفکرین بھی، خدا انہیں خوش رکھے، سیدھی سمجھ میں آنے والی بات سے گریز کر کے مبداً و معاد کے پیچیدہ مسائل اور فلسفہ سمجھانے میں فکری قوّت صرف کر رہے ہیں جس سے ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اس کو گویا صرف وہی سستے نعرے ہی پر کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انتخابات جو کہیں ہوئے اور کہیں نہ ہو سکے، ووٹ تقریباً ایک اجنبی شخص کو ملے اور ملے بھی ان لوگوں کے مقابلہ میں جو روئے زمین کی تمام ترخوبیوں کا پرچار کر رہے تھے۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ الٹا ان لوگوں سے ہی گلہ ہے کہ انہوں نے اعلیٰ محاسن کو رد کر دیا اور ان کے مقابل ایک صاف سمجھ میں آنے والی بنیادی انسانی ضرورت، روٹی، کپڑا اور مکان کو قبول کیا۔ اگر حضورؐ کے ارشاد مبارک کو سامنے رکھا جائے تو مذہب کے علاوہ عالم انسانی کی ضرورت روٹی، کپڑا، مکان اور پانی ہی تو ہے۔

Marfat.com

ظاہری اسباب کا فقدان اور قبول عام

اس قسم کے حالات میں مجھ جیسے شخص کا جس کا اپنا ایک نظریہ ہو' ایک عقیدہ اور طرز عمل ہو' اس کاروبار سیاسیات میں موجود ہونا اور پھر ایک نمایاں حیثیت حاصل کرنا جو بھی وہ ہے' بذات خود ایک تعجب انگیز بات معلوم ہوتی ہے میرے پاس اگر ان اسباب و ذرائع میں سے جو ہماری سیاست میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ایک بھی نہ ہو پھر بھی میں اللہ کے بھروسے پر اپنا کام کرتا رہوں۔ خدا کے فضل و کرم کے سوا اس کی کوئی اور دلیل نہیں ہے۔ نہ دولت' نہ جاگیر' نہ کاروبار' نہ محلّات' نہ کوئی بڑا اور موثر قبیلہ اور نہ ہی میں قبیلائی سیاست پر یقین رکھتا ہوں' نہ میں کسی مذہبی فرقے کا پیشوا یار ہنما ہوں۔ نہ کوئی کارخانہ دار ہوں' نہ میں کسی سرمایہ دار کا ایجنٹ' محض ایک متوسط گھرانے کا کسان ہوں۔ مگر اللہ بھلا کرے ان مسلمان بھائیوں کا جن کی شفقت' مروّت اور ہمدردی میرے ساتھ رہی اور میں بھی حوصلہ مندی سے کام کرتا رہا۔ یہ معاشرہ تو ایسا ہے کہ اس ملک کے سوشلسٹوں کو بھی اگر مرکزیت ملی تو وہ بھی اس ملک کے سب سے بڑے جاگیردار کے ہاں "جو اماں ملی تو کہاں ملی" ہمارے ہاں سرمایہ داری کا ذہن ایک زہر قاتل کی طرح ہر جسم میں سرایت کر چکا ہے۔ سوشلسٹ ہو' کمیونسٹ ہو یا اسلامی مساوات کا علمبردار' سب ہی لوگ اِلّا ماشاء اللہ' کسی نہ کسی طریقہ سے سرمایہ دار اور امیر بننے کی فکر میں ہیں اور اس کے لئے ہر جائز و ناجائز ذریعہ کو عین کار ثواب سمجھتے ہیں۔

نفاذ اسلام کے لئے بنیادی شرط

میں نے جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے ایک مرتبہ اسلامی نظام کے بارے میں کہا تھا کہ اس میں سردست جلدی نہ کریں وہ لمبی بات ہے۔ یہاں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اسلام کا جو قانونی نظام یا نظام عدل آپ نافذ کرنا چاہتے ہیں' یہ اکیلا چل نہیں سکتا۔ ہر نظام کا دار و مدار اس کے معاشی نظام پر ہوتا ہے اور اسلام کا معاشی نظام اس لئے نافذ نہیں ہو سکتا کہ ابھی تو اس کی ترجیحات پر ہی اتفاق رائے نہیں ہے اور معلوم نہیں کبھی ہو گا بھی کہ نہیں۔ کیونکہ' میں نے ان سے کہا ہمارے ملک کے سیاسی رہنما' حکمران اور علماء غرضیکہ وہ سب لوگ یا اکثر جو اس نظام کو نافذ کر سکتے ہیں، کسی نہ کسی درجے میں سرمایہ دار ہیں۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ موجود نہیں ہے تو وہ اس کے حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش میں ہے جب کہ اسلام کا معاشی نظام تو علامہ اقبالؒ کے مطابق' اور وہی صحیح بھی ہے۔ "خواجہ را پیغام مرگ" ہے' اس کو کون نافذ کرے گا" ابھی تو ہمارے ہاں انسان کی بنیادی ضروریات کی اہمیت کو بھی حکومت کے ہاں تسلیم نہیں کیا جاتا چہ جائیکہ کوئی ان کو مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول کرے اور جب تک یہ بات ممکن نہیں ہو گی قانونی ڈھانچہ کسی بھی وقت زمین پر آرہے گا تیہ سارا قصور نافذ کرنے والوں کی گردن پر ہو گا اور

Marfat.com

جنرل محمد ضیاء الحق

Marfat.com

اس کا بوجھ بھی۔ اسلامی نظام میں اس معاشی کیفیت کو اس سے زیادہ کوئی چیز واضح نہیں کرتی جو سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "کتے کے بھوکے رہنے میں عمر کو ذمہ دار ٹھہرا کر متعین کر دی تھی" کیا آج اس کا شائبہ تک ہمارے ہاں موجود ہے؟۔

ملکی اور قومی سیاست کے بارے میں میرے نظریات

اب کچھ باتیں اس بارے میں بھی بے محل نہ ہوں گی کہ قومی و ملکی سیاست میں میری سوچ اور فکر دراصل ہے کیا اور میں اس کو نبھانے کے لئے کیا کچھ کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ اگر یہ بات معلوم نہ ہو اور سمجھ نہ آئے تو پھر باقی جو کچھ میں نے کہا وہ بھی یقیناً سمجھ نہیں آئے گا اور ہر ایک کا قیاس اسی کی ذات کی بنیاد پر ہو گا اور وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہو گا۔

چونکہ میں سیاسیات میں نظریاتی سیاست پر یقین رکھتا ہوں اس لئے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے کہ میں حکومت کے اندر ہوں یا باہر۔ البتہ وسائل اور ذرائع کا فرق ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ کہنے سے کہ "میں حکومت کے اندر ہوں یا باہر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" حکومت کی اہمیت کم کرنا نہیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حکومت میرے لئے بذات خود کوئی مقصود نہیں بلکہ وہ ایک اہم ذریعہ ہے اور ایک ناگزیر سنگ میل ہے۔

اگر مقصود صرف حکومت ہو تو سیاست کے انداز مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس میں پھر کسی کا مسلمان ہونا یا مکیاولی اور چانکیہ کا پیروکار ہونا برابر ہے۔ عملی اطلاق کے اعتبار سے نظریاتی سیاست کا مطلب تو یہ ہے کہ اس میں وہ نظریہ سب سے مقدم ہو اور اس کے کارکنوں اور حکومت دونوں کے پورے کردار پر اسی کی چھاپ ہو۔ اس میں پھر جھوٹ' فریب' لالچ' دغا کچھ نہ ہو گا نہ اس پر کسی گرمی سردی کا کوئی خاص اثر ہو گا۔ اس کے برعکس جب سیاست محض حکومت کے حصول کی خاطر ہو اور حکومت خود ایک مقصد بن جائے تو میرے خیال میں سیاست بے مقصد ہو جاتی ہے اور اس میں ہر قسم کا فریب' ظلم' دغا' جھوٹ وغیرہ اس کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ مگر اصول یہی ہے کہ جس کا جو نظریہ ہے' اس کا طرز عمل اسی کی عکاسی کرے گا' اگر ایسا نہ ہو تو وہ کارکن بھی جھوٹا اور نظریہ بھی ناقابل عمل۔ نظریات کا صرف منشور کے کتابچے میں درج ہونا کافی نہیں ہے بلکہ وہ دل و دماغ کی لوح پر بھی نقش ہوں' تب ان کو دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

ہمارے نظریاتی کارکن

ہمارے ہاں نظریاتی کارکن پاکستان بناکر کسی نہ کسی رنگ میں فوت ہی ہوگئے۔ کچھ جسمانی طور پر، کچھ ذہنی اور فکری طور پر، اور کچھ عملی طور پر۔ جو کوئی بچا ہوا ہوگا اس نے بھی نظریۂ پاکستان کو بہت سنبھال کر سینے میں دفن کر دیا ہوگا۔ لہٰذا موجودہ حضرات کی سطح پر تو کسی کے نظریاتی ہونے یا نہ ہونے میں سچی بات ہے، محض حسن ظن سے ہی کام لیا جاسکتا ہے۔

جب کوئی نظریاتی کارکن اپنا سودا کرلیتا ہے اور حالات کے ساتھ مصالحت کرلیتا ہے تو اس دن وہ خود بھی فوت ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی اس نے ماضی میں جو کچھ اچھا کیا ہوتا ہے وہ بھی ایک ہنگامی اور جذباتی فضا کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ مستقبل تو پھر قطعاً تاریک ہوجاتا ہے۔ میں اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اصولوں پر ایک بار سودا کر لینے کے بعد کوئی شخص از سر نو تازہ دم ہو کر وہی پرانا نظریاتی کارکن بن جائے۔ کسی کرامت کے طور پر ایسا ہو تو ہو مگر عام انسانی فطرت میں یہ ناممکن کے قریب ہے۔ وہ کتنا ہی مرتبہ کیوں نہ حاصل کرلے مگر وہ کھوئی ہوئی اصلیت کو دوبارہ واپس نہیں لاسکتا۔ سیاسی کارکنوں کی بالخصوص اور تمام اہل علم وفن کی بالعموم اپنی اپنی عصمت ہوتی ہے، جس کا تحفظ عفت مآب خواتین کی طرح ہی کرنا ضروری ہوتا ہے بلکہ اس لحاظ سے اول الذکر بے حد اہم ہے کہ شخصی عصمت میں کسی خرابی سے وہ مجموعی نقصان نہیں ہوتا جو علی الترتیب سیاسی، علمی اور فنی عصمت کی خرابی سے مرتب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس سلسلہ میں اب کوئی قید نہیں رہی بلکہ الٹ یہ ہے کہ جس کی کوئی عصمت ہی نہیں ہے، وہی اس کا زیادہ دعویدار اور مدعی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کا علم ہونے کے باوجود اس دعوے سے انحراف کر سکے۔ ایمان کا جو آخری درجہ حضرت رسالت پناہ علیہ السلام نے فرمایا وہ بھی بالعموم مفقود ہے۔

سوشلسٹ کارکن

ہمارے ہاں نظریاتی کارکن اگر کسی جگہ ہوسکتے ہیں تو وہ شاید سوشلسٹوں کے ہاں ہوں۔ شاید اس لئے کہا کہ وہ بھی ہمارے اسی معاشرے کی بے یقینی کی پیداوار ہیں۔ وہ بھی اپنے نظریئے میں اتنے ہی "سچے" ہوں گے جتنے باقی لوگ ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں تو ایک اضافی بات یہ ہے کہ جب دوسرے لوگ عام طور پر اپنے نظریئے کو اپنے لئے کام میں لانے کی فکر میں ہوتے ہیں تو ہمارے ہاں ہم دوسروں کے لئے کام کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ ذہنی غلامی ہنوز ہر جگہ موجود ہے، ابھی گئی نہیں۔ اسلام ہو یا سوشلزم، کمیونزم ہو یا سرمایہ داری، تبھی تو میں نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں جل کر کہا تھا لوگ ایشیا کو سرخ و سبز تو بنا رہے ہیں مگر جو لوگ تیس چالیس سالوں میں محض پاکستانی نہیں بن

Marfat.com

سکے‘ان پر کون احمق یقین کرے گا کہ وہ پورے ایشیا کو سرخ و سبز بنانے والے ہیں" ایک ذمہ دار شخص نے سنایا تھا کہ چین کے سفارت خانے والے کوئی فلم دکھا رہے تھے جس میں مخلوق بھٹکتی پھر رہی تھی ۔ حتیٰ کہ عرب بھی تو اوپر سے ایک فرشتہ "ماؤ" کی لال کتاب لہرا رہا ہے اور ان کی رہنمائی کر رہا ہے تو اس پر ہمارے ایک ذمہ دار صاحب نے چینی سفیر سے کہا "یور ایکسیلنسی آپ بے فکر رہیں‘ اس کتاب کا کوئی اثر نہیں ہو گا" اس نے پوچھا کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ "جن لوگوں نے چودہ سو سال سے خدا کی کتاب پر التفات نہیں کی وہ اتنی جلدی "لال کتاب" کو کیسے قبول کریں گے" ۔

بہرحال ان کے ہاں نظریاتی کارکنوں کے وجود کا گمان اس لئے ہوتا ہے کہ بالعموم وہاں لگتا کچھ نہیں نہ ہینگ نہ پھٹکڑی ‘نہ وضو کرو‘ نہ نماز پڑھو‘ نہ روزے رکھو‘ نہ کسی اور تکلیف میں پڑو۔ بال کچھ اور لمبے کرو‘ دن کو بارہ بجے سو کر اٹھو‘ اسلام کو گالیاں دے دو‘ قضائے حاجت کے بعد ہاتھ بھی نہ دھوؤ۔ غرض ہر اخلاقی بندھن سے آزاد ہو جاؤ تو یہ ہوا ہمارا صحیح سوشلسٹ یا کمیونسٹ ظاہر ہے یہ کام ایسا ہے کہ اس سے آسان دوسرا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اگر بعض لوگوں کے ظاہری اطوار اور طور طریقوں سے اندازہ لگایا جائے تو یوں لگتا ہے کہ لوگ اصل میں نہ سوشلزم چاہتے ہیں نہ کمیونزم بلکہ سیدھی اور صاف "مزدکیت" نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ "بے چارے" اسلام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں‘ وہ بھی خالصتہً اپنی خواہشات نفس کے بندے ہیں اور ایسا اسلام لانا چاہتے ہیں جس پر صرف کسی ایک گروہ یا فرقے کی چھاپ لگی ہوئی ہو۔

نظریات اور لوگوں کے مسائل

دوسرے ہمارے راجہ ظفر الحق صاحب ہیں جو روز و شب بے چارے نظریہ پاکستان کے لاشے پر نوحہ خوانی کرتے رہتے ہیں۔کئی مخلص پاکستانی بھی راجہ صاحب سے پرانی رفاقت کے باعث پوچھتے ہیں کہ "کیا ہمارے راجہ جی کے پاس کوئی اور بات کہنے کے لئے نہیں ہے" ۔ کوئی کہتا ہے "یار خدا کے لئے ان کو بند کرو‘ ہم تنگ آ گئے ہیں۔ ہمارے مسائل کا بھی اگر کبھی ذکر کر دیں تو کیا برا ہے‘ کیا ہم نظریئے کو ہی کھائیں‘ پئیں اور اسی میں گھر بنائیں" ۔

بعض جگہ پرانے لوگوں نے بھی مجھ سے پوچھا کہ بھائی آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ بات بالکل وہی ہے جو میں کہہ آیا ہوں کہ لوگوں کے مسائل حل ہونے کی بجائے الجھتے چلے گئے۔ غریب آدمی کو اس کو عزت و آبرو کا تحفظ نہیں ملا۔ اس کے لئے آزادی مصیبتیں لے کر آئی اور اب خدا خیر کرے "اسلام" بھی لایا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں اس عام آدمی سے کیا کیا ٹیکس وصول ہو گا۔ آزادی کا‘ جمہوریّت کا‘ سوشلزم کا‘ اسلام کا۔

Marfat.com

جس طرح بیماری میں صحت مندی کی بات اور اسی طرح اس کے برعکس بات سمجھ میں نہیں آ سکتی، اسی طرح آج یہ بات سمجھنا بھی مشکل ہے کہ ہم لوگ کس طرح نظریاتی لشکر کی قدر کرتے رہتے ہیں۔ اس کی قدر تو اسی کو ہو سکتی ہے جس کے اندر کچھ نظریاتی رمق باقی ہو۔ جو لوگ نظریئے کو بھی محض ایک آلہ اور مصلحت جانتے ہوں ان کو ان گرانمایہ موتیوں کی قیمت کیا معلوم ہے "قدر زر زرگر بداند......"۔

دوسروں کی پہچان

ویسے تو کسی بھی شخصیت کو کماحقہ سمجھنا تقریباً ناممکن ہے تاوقتیکہ اس نے خود ہی اپنی کچھ حدود مقرر نہ کرلی ہوں۔ یہ سمجھ اس لئے بھی مشکل ہے کہ خود اپنی ہی سمجھ مشکل ترین کام ہے جیسا کہ کسی نے کہا "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) بعض لوگ اس کو حدیث شریف بھی کہتے ہیں۔ جب خود اپنے نفس کو سمجھنا اس قدر مشکل ہے جس قدر اپنے رب کو سمجھنا تو دوسروں کو کماحقہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس سمجھنے سمجھانے میں ایک اور اہم بات بھی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی مادہ پرست انسان اس شخص کو کیسے سمجھ سکتا ہے جس کو دل بے مدعا کا کچھ حصہ ملا ہو، جو شخص اسباب سے بلند ہو گیا، وہ اسباب کی نسبت سے لامحدود ہو گیا۔ اور جو بے غرض ہو گیا اس کی تو بات ہی اور ہے۔ ڈاکٹر اقبال صاحب نے جو فرمایا "جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے"۔ میں اس خصوصیت کا کوئی دعویدار تو نہیں ہوں، مگر جب اپنی گذشتہ زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے جابجا اپنے دل کے بے غرض ہونے کے کافی نشانات بھی ملتے ہیں۔ الحمدللہ علی ذلک یہ حرص و ہوس کے غلام میرے بارے میں کیا رائے دے سکتے ہیں یہ تو بس اندھوں کے شہر میں مولائے روم کے ہاتھی والی مثال کے مصداق ہیں۔

مجھے یہ چند باتیں اس لئے کہنا پڑی ہیں کہ سیاست میں میری حمایت و مخالفت کرنے والے دونوں کو کچھ خود میری اپنی زبانی بھی معلوم ہو جائے کیونکہ ہر دو فریق زیادہ تر اپنی اپنی معلومات پر ہی انحصار یا قیاس کرتے ہیں۔

حکومت مقصد نہیں، مقصد کا ذریعہ ہے

دوسری بات میری سیاست کی یہ ہے کہ میں نے اس کو خدا کے فضل و کرم سے حتی الامکان اقتدار کی بے مہابا خواہش سے پاک رکھا ہے۔ یہ بھی اسی مالک الملک کا احسان عظیم ہے، ورنہ کسی کی کیا بساط ہے کہ وہ خود ایسا کر سکے وہ جسے چاہتا ہے جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی یہی

Marfat.com

ذہن نشین کروانے کی کوشش کرتا رہا کہ حکومت ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔ ایک سنگ میل ہے منزل نہیں۔ چنانچہ یہ بھی اسی مالک کا احسان ہے کہ میں ہر سہ بار جو حکومت میں داخل ہوا تو میرا یقین ہے کہ اعلیٰ عقیدے کا وافر مظاہرہ کرنے کی توفیق ملی۔ نظریاتی کارکنوں کے لئے ایک مشکل مقام یہ ہوتا ہے کہ اگر حکومت پر ان کے مخالف نظریات والے لوگ قابض یا فائز ہوں تو ان کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر حکومت خود انہی کو مل جائے تو کار حکومت سے ناواقفیت اور پھر حکومت کی دلفریبیوں کی کشش کے باعث خود نظریات بھی متاثر ہونے لگتے ہیں۔ تاہم ہماری بعض حکومتوں کے ساتھ ہمارے تصادم کا ایک بنیادی سبب یہی رہا ہے کہ وہ ہمارے نظریات کے مخالف تھے جب کہ یہ نظریات کوئی ہماری ذاتی ملکیت نہیں تھے بلکہ یہی ہمارا تاریخی ورثہ اور قومی اثاثہ ہیں۔ بدقسمتی سے جو لوگ اقتدار پر ہوتے ہیں وہ مخالف کی ہر بات کو اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ بات اچھی ہو یا بری، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اقتدار سے تو متصادم نہیں ہے کیونکہ اقتدار میں رہ کر تو اقتدار ہی ارفع و اعلیٰ مقصد دکھائی دینے لگتا ہے۔ اقتدار کی یہ بھی ایک ناگزیر بوالعجبی ہے۔ ہمارے ہاں تو حکمران خود کو عقل کل سمجھنے لگتے ہیں اور باقیوں کو جاہل اور بے شعور۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ خود کو ہی ملک بھی اور ملت بھی سمجھتے ہیں۔ جو ان کا مخالف ہو وہ عقل کا، مذہب کا، ملک اور ملت، سب کا مخالف سمجھا جاتا ہے اور اسی طرح اس کے برعکس یعنی جو ان کی حمایت کرے وہ عقلمند اور محبّ وطن وغیرہ قرار پاتا ہے۔

اقتدار اور حکومت کے بارے میں البتہ میری سوچ میں اتنی بات ضرور ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بعض امور کو میں برسر اقتدار لوگوں کی نسبت بہت بہتر طریقہ سے انجام دے سکتا ہوں۔ یہ نہ تو کوئی خود غرضی ہے نہ تعلّی، بلکہ اس کا مظاہرہ بھی کئی بار ہو چکا ہے۔ کیونکہ سیاست میرا مشغلہ نہیں ہے۔ میں تو اس فن کے تمام نشیب و فراز پر مسلسل غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ یہ ایسا کام ہے جس کے لئے میری پوری زندگی صرف ہوئی ہے اور جس کو میں عبادت کا درجہ دیتا ہوں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی نسبت جو محض ذاتی غرض کے لئے یا مشغلے اور مصلحت کے لئے یا پھر محض حادثے سے سیاست میں آ جاتے ہیں مجھ جیسے شخص کی معلومات، صلاحیت اور استعداد زیادہ ہونی چاہئے۔

حاکم اور رعایا کا باہمی تعلق

حکومت کے بارے میں میری سوچ میں ایک یہ بات بھی ہے کہ اس ملک میں حکومت اور عوام میں حاکم اور محکوم کا تصوّر نہیں ہونا چاہئے۔ جبکہ انگریز کے چلے جانے کے باوجود ہم ابھی تک اسی تصوّر میں مبتلا ہیں۔ کچھ مفاد پرستوں کے سوا کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ بھٹو صاحب کے دور حکومت میں کچھ تبدیلی ہو رہی تھی مگر وہ بے تدبیری اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہو گئی۔ یہ حاکمی و محکومی کا موجودہ تصوّر میرے خیال میں نہ

Marfat.com

تو اسلامی ہے' نہ آزادی کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ بلکہ یہ حالت تو آزادی کے وجود کے لئے نہ صرف خطرہ ہے بلکہ اس کی نفی ہے، نیز اسلام بھی ایسے غلامانہ ماحول کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اسلام جو اس قسم کے ماحول میں پرورش پائے گا وہ شیر کو بھیڑوں کے ماحول میں پرورش کرنے کے مترادف ہو گا۔ وہ رسول اللہؐ کا اسلام نہیں بلکہ اس حکومت کی چھاپ کا اسلام ہو گا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں جمہوریت پر زور دیتا ہوں' نہ اس لئے کہ خدانخواستہ جمہوریت میرا مذہب ہے۔

اختلاف رائے اور دشمنی میں فرق

چنانچہ اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ میں اختلاف رائے اور دشمنی میں فرق بھی کرتا ہوں۔ اختلاف رائے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ بشرطیکہ وہ بدنیتی پر مبنی نہ ہو' اس کا فیصلہ بھی خود اختلاف کرنے والے ہی کرنا ہوتا ہے۔ دشمنی کی تو ہمارے ہاں ضرورت ہے نہ اس کی گنجائش۔ میں جب ماضی پر اس لحاظ سے غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ ہمارا کتنا علمی' فکری اور جسمانی سرمایہ محض فضول قسم کے اختلافات اور ان کی بنا پر دشمنی کی فضا کی نذر ہو گیا' تو عجیب صدمہ ہوتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اختلاف رائے کے باوجود کسی نہ کسی کام میں مفاہمت نہ پیدا کر سکیں۔ اختلاف رائے کو ناجائز اور دشمنی قرار دے کر ہم نے اپنے لئے سوائے منفی سوچ کے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا بیشتر زور اور زر ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزمائی میں صرف ہو رہا ہے۔ اسی منفی فکر کا نتیجہ ہے کہ جس میں کوئی معمولی سی بھی صلاحیت ہے۔ وہ اپنا راگ علیحدہ الاپ رہا ہے۔ وہ حکومت چاہتا ہے مگر کسی کی شراکت کے بغیر' بلکہ بغیر اس کے کہ کوئی اور اس کا دعویدار بھی ہو۔ وہ دوسروں کو تو حکومت کی خواہش کا حق بھی دینے کو تیار نہیں۔

حکومت کے اندر اور باہر ذمہ دار لوگوں کے درمیان مذاکرات اور افہام و تفہیم کی راہ ہر وقت کھلی رہنی چاہئے۔ کیونکہ دشمنی کی اس فضا کا ایک سبب ایک دوسرے سے مل بیٹھنے سے انکار اور آپس کی دُوری بھی ہے۔ جس کا نتیجہ ایک عین فطری عمل ہے۔ بلکہ کئی ایک اختلاف کی وجہ بھی محض یہی ہے۔ وہ اختلافات جو بے خبری' غلط اطلاعات اور ایک دوسرے سے دوری کے باعث پیدا ہوتے ہیں بلکہ اختلافات زیادہ تر ہوتے ہی وہی ہیں' ان کو تو دور کرنا چاہئے۔ پھر یہ کہ سیاست میں ایک ایسا مقام بھی تو باقی رہنا چاہئے جو گروہی اور شخصی مفادات سے بلند ہو۔ وہ قومی ہو اور ملی ہو۔ تاکہ وہاں تو سب لوگ مل کر سوچیں اور مشترک عمل کی کوئی راہ دریافت کریں۔ میں تو جب اپنے ملک کے مسائل' ان کی رفتار اور اپنے گردوپیش کے حالات کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہماری پوری قیادت اور حکومت دونوں ہی یکجا ہو جائیں' تب بھی ان مسائل کا کماحقہ مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے' چہ جائیکہ ہم نہ صرف علیحدہ علیحدہ ہوں

Marfat.com

بلکہ متفرق اور باہم دست و گریبان ہوں۔ ہم اپنی تمام ملکی و قومی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بھی اگر اس ملک کا حق ادا کر دیں تب بھی یہ غنیمت بلکہ ایک تاریخی کارنامہ ہو گا۔

قصور صرف حکومت سے باہر والوں کا ہی نہیں رہا بلکہ میرے خیال میں ذمہ داری بھی فریقین کی حیثیت کے تناسب سے ہی تقسیم اور متعین کی جا سکتی ہے۔ حکومت کو ہمیشہ اس کار خیر میں پہل کرنا چاہئے اور اس امر کے لئے فضا ہموار کرنی چاہئے نہ کہ معاملہ اس کے عین برعکس ہو۔ حکومتیں دست بستہ اطاعت کا مطالبہ نہ کریں بلکہ بھائیوں کی طرح یا زیادہ مناسب یہ کہ ایک خاندان کے بڑے فرد کی طرح اعتماد، تعاون اور افہام و تفہیم کی راہ ہموار کریں۔ جب ذمہ داریوں میں فرق ہو گا تو سوچ میں بھی فرق ہو گا۔ جب اطلاعات کے ذرائع مختلف ہوں گے تو اطلاعات میں بھی فرق ہو گا اور پھر لامحالا فیصلوں میں بھی۔

ہمارے ہاں اطلاعات کا اتنا وسیع فرق ہوتا ہے کہ اس کو درست کرنے کا مل بیٹھنے کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے بعض ایسے معتبر اور بزرگ بلکہ قومی شخصیتوں کو دیکھا کہ وہ بڑے اہم فیصلے کر رہے تھے مگر جن اطلاعات کی بنا پر وہ فیصلے صادر کر رہے تھے وہ سرے سے غلط تھیں۔ بعض کا تو مجھے براہ راست علم تھا۔ یہ اطلاعات والا معاملہ درحقیقت نہایت اہم ہے خواہ وہ شخصی معاملات ہوں یا قومی۔ یہی وجہ ہے کہ خود پروردگار عالم نے اس کی طرف توجہ دلائی اور بالوضاحت فرمایا "وَاِذَا جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ الخ" (جب کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو، مبادا کسی قوم کو نقصان پہنچاؤ تو اپنے کئے پر پچھتاؤ) یہاں جب میں لفظ "فاسق" پر غور کرتا ہوں، تو یوں لگتا ہے کہ اس عموم سے شاید ہی کوئی مستثنیٰ ہو۔ کچھ نہ کچھ فسق تو ہر شخص میں موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح حکومت کے اندر کی حالت کا باہر سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ اس بارے میں بھٹو صاحب نے ایک بڑی برمحل اور دلچسپ بات سنائی جب وہ پہلی بار صدر ہو کر امریکہ کا دورہ کر کے آئے، تو میں ان کو ملنے گیا اور امریکہ کے دورے کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے "دورہ جیسا بھی تھا، مگر دلچسپ بات یہ تھی کہ صدر نکسن نے ملتے ہی کہا "تم جو باہر بہت شور کرتے تھے کہ سیٹو سینٹو سے پاکستان کو نکل جانا چاہئے تو کیا بچا لیا مشرقی پاکستان کو؟" بھٹو کہنے لگے کہ "مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اطلاعات کے باعث سوچ میں کتنا فرق پڑ جاتا ہے اور لوگ حکومت سے باہر جو کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں یا کہتے ہیں، اس کا معاملہ حکومت کے اندر کیا ہوتا ہے"۔

سیاست ایک مقدس اور مشکل ذمہ داری ہے

جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں سیاست میرے نزدیک کوئی دفع الوقتی مشغلہ، کوئی مصلحت، کوئی مجبوری، کوئی تجارتی یا معاشی ذریعہ یا کوئی شخصی احتیاج کی بات نہیں ہے بلکہ وہ ایک مقدس ذمہ داری ہے۔ ایک فریضہ ہے، ایک عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بحیثیت صدر بھی کہ جس کا مجھے کوئی ذاتی یا شخصی

Marfat.com

مفاد نہ تھا' ایک عام مزدور سے زیادہ کام کرتا تھا۔ جب میں نے صدارت چھوڑی تو میں اپنے آپ کو جسمانی طور پر اپنی عمر سے کم از کم تیس سال زیادہ کا محسوس کرتا تھا۔ جس شخص کی سوچ اس قسم کی ہو' وہ اپنی عبادت میں کسی بھی غلاظت کو کیوں شامل کرے گا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کسی چھوٹے یا بڑے جلسے یا میٹنگ میں یا کسی سرکاری مجلس میں نماز کے لئے وضو کے بغیر شریک ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر نماز کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام امور میں اور خاص کر کار سیاست میں امداد اور رہنمائی کی درخواست کرتا رہتا ہوں۔ آج کل کے حکمرانوں کی عادت ہو گئی ہے کہ وہ کسی عام سائل کی بات کو اولاً تو سنتے ہی نہیں ہیں اور اگر سنتے بھی ہیں تو کسی کو انکار کر دیتے ہیں اور کسی کو محض ٹال دیتے ہیں' لیکن دوسروں کی بہ نسبت اگرچہ عام لوگ بہت زیادہ میرے پاس آتے تھے' پھر بھی میں نے خدا کے فضل و کرم سے کبھی کسی کی درخواست کو غیر متعلق نہیں سمجھا' نہ اس کو محض ٹالنے کے لئے سن لیا میں اس کو بھی فریب اور دھوکہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح کسی سے ٹال مٹول کیا جائے۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ عملاً کوئی کھیل نہیں ہے۔ جو کوئی اس پر عمل کرے گا اس کو معلوم ہو گا کہ یہ کیا ہے۔ اس راہ پر چلنے کی اپنی مشکلات ہیں کہ اگر خدائے پاک امداد نہ فرمائیں تو انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ موجودہ دور میں سیاست کو عبادت بنا لے۔ میں ان لوگوں کی بات نہیں کرتا جو از خود اپنے حق میں فتویٰ دیتے ہیں کہ ہمارا اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا' وضو توڑنا اور کرنا سب عبادت ہے۔ خواہ باقی بندگی کے امور سرے سے منقطع ہو جائیں۔

سیاست کے بارے میں عوامی تاثر

ہمارے ہاں سیاست کے بارے میں عام و خاص کا تاثر یہی رہا ہے کہ کار سیاست محض دھوکہ ہے' فریب اور دجل ہے جو حکومت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور حکومت ذاتی مفادات حاصل کرنے کا آسان ذریعہ۔ کسی کو ان خصائل کا مرکب بتانا مقصود ہو تو کہہ دیتے ہیں "فلاں شخص بڑا سیاسی ہے"۔ عرصہ دراز تک متحدہ ہندوستان میں سیاست نیک لوگوں کے لئے شجر ممنوع رہا۔ اس خیال پر یقیناً کسی بات کا اثر ہو گا۔ کئی جگہ تو اب بھی تقسیم یہی ہے کہ علماء و فضلا محض علمی اور غیر سیاسی امور پر ہی گفتگو کرتے ہیں اور سیاست ایک خاص حلقے کی میراث قرار پائی۔ یہاں تو سیاست اکثر و بیشتر صرف ان لوگوں میں رہی جن کا خدا ان کی جیب میں ہے۔ جو کمزور کو کمزور تر بنانے میں ہر قسم کے مظالم کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ سیاست پر جو لوگ فائز رہے ہیں یا اس پر اپنا حق سمجھتے ہیں' ان کی غالب اکثریت مغرب کی تعلیم سے سند یافتہ ہے بلکہ یہی ان کی ایک اعلیٰ امتیازی حیثیت ہے۔ صرف تعلیم ہی مغربی نہیں بلکہ دل و دماغ بھی مغربی ہو تو بڑائی اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں سے کچھ اچھی باتیں سیکھنے کی بجائے مغرب کی برائیوں کو ساتھ لاتے ہیں۔ میکالے کی فکر کی صحیح اور زندہ جاوید تصویر ہوتے ہیں۔ خود انگریز کو عوام سے اتنا بُعد نہیں تھا جتنا ان ذہنی غلام حضرات کو ہے۔ اس کا ایک بدقسمت نتیجہ یہ ہوا کہ جو اچھے لوگ بھی آزادی کے بعد سیاست کا

Marfat.com

شوق فرمانے لگے، وہ بھی "ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد" کا مصداق بن گئے۔ بعض ایسے اچھے لوگوں کو جھوٹ کیا، سفید جھوٹ بولتے سنا اور سامنے بیٹھ کر سنا کہ خود اپنے ہی کانوں پر شبہ ہونے لگا۔ ایسے ماحول میں سیاست کو دل سے عبادت کا درجہ دینا خاصا مشکل کام ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ خدا کی مہربانی کے سوا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بھی اسی کا کرم ہے کہ مجھے اس پوری سیاسی زندگی میں کسی مقام پر بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نہ کسی کو فریب دینے یا جھوٹے وعدے کرنے کی نوبت آئی۔ سچی بات ہے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ آخر یہ لوگ جھوٹ بولتے کیوں ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ بعض لوگوں کو جھوٹ بولتے سنا مگر میرے نزدیک وہ کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی جس کے لئے وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ مجبوری حالات کی ہوتی ہے یا محض عادت کی۔ لیڈر یا حکمران کا جھوٹ بولنا تو اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے دائرہ عمل کی نسبت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ کسی لیڈر یا حکمران کا جھوٹ بولنے پر دلیر ہو جانا سب سے بری بات ہے۔ اس سے گویا پورے کا پورا معاشرہ بغیر کسی تکلیف کے از خود متاثر ہو جاتا ہے۔ اسی مصلحت کو شاید غیروں نے تو سمجھا اور اپنایا بھی، مگر ہم نے جن کے گھر کی بات تھی، نہ سمجھا نہ محسوس کیا اور نہ اپنایا۔ چرچل کی بات بہت معروف ہے۔ اس نے کہا ہے کہ "میں ذاتی زندگی میں تو جھوٹ بول لیتا تھا، مگر بحیثیت وزیر اعظم میں نے جھوٹ نہیں بولا" جبکہ ہمارے ہاں تو معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں نے چرچل کی مثال اس لئے دی کہ خلافت راشدہ والی بات ہمارے سیاستدانوں کے نزدیک ایک ناقابل حصول آئیڈیل ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ معاشرہ، ماحول اور وقت کے تقاضے بدل گئے ہیں۔ مگر کسی بھی مغربی کی بات ہو تو اس کو دل و جان سے سچا مانا جاتا ہے۔ کئی لوگ تو محض مذہبی آقاؤں کی روح کو ہی خوش کرنے کے لئے ان کی باتوں پر ایمان رکھتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث اور صحابہ کرامؓ کی باتیں ان کے کانوں پر سخت ناگوار اور گراں گزرتی ہیں۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔ آمین!

تعاون اور عدم تعاون کا طرز عمل

میرے سیاسی طرز فکر کا ایک حصہ جس کا ذکر میں اکثر اجتماعات میں کرتا رہتا ہوں، وہ یہ ہے جس کی بنیاد قرآن حکیم کے اس ارشاد پر ہے کہ "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (ترجمہ..... نیکی اور پرہیز گاری پر تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی پر تعاون نہ کرو) میں خود بھی اخلاص مندی کے ساتھ اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق اسی پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اپنے تمام ساتھیوں کو بھی اسی کا مکلّف کرتا ہوں۔ میں نے نہ کبھی مخالفت کرنے والوں کو کافر قرار دیا، نہ حمایتیوں کو جنت کا سرٹیفکیٹ دیا۔ بلکہ میں نے کسی ذاتی اختلاف کی بنا پر کسی کے خلاف دل میں کوئی رنج یا بغض رکھنا بھی جائز نہیں سمجھا۔ ایسے کتنے ہی بھائی ہیں جو محض میری ذاتی مخالفت کو اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں مگر میں اس کو وہ

Marfat.com

ذوالفقار علی بھٹو اور کے۔ ایچ۔ خورشید

Marfat.com

اہمیت نہیں دیتا۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ ایک طویل اعتکاف کے دوران "رکن دین" کتاب میں پڑھا کہ رمضان المبارک کی ۲۷ویں رات کی فضیلت کا اثر جن کو نہیں پہنچتا ان میں سے ایک وہ شخص ہے، جو کسی مسلمان بھائی کے خلاف تین دن سے زیادہ رنج باقی رکھے گا۔ میں نے جب اس نقطۂ نظر سے اپنے آپ پر غور کیا تو مجھے کے ایچ خورشید صاحب کے ساتھ دل میں ناراضگی دکھائی دی۔ ان دنوں ان کے ساتھ بہت تلخی تھی۔ تاہم میں نے وہیں اس سے توبہ کی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج تک اس کدورت سے بچا ہوا ہوں۔ ان کے ساتھ نظریاتی اور سیاسی اختلاف اپنی جگہ قائم ہے لیکن ان کی ذات کے ساتھ کسی قسم کا بغض، حسد یا ناراضگی نہیں ہے۔ اللہ پاک اس میں استقامت عطا فرمائے۔

اللہ والوں کا طرز فکر

یہ بھی ذکر کر دوں کہ ان ہی دنوں اس بزرگ ہستی کے ساتھ، جن کو ہم اکٹھے ملے تھے، سفر کر رہا تھا تو ان کی موجودگی میں ازراہ مذاق ایک صاحب کو میں نے اتنا کہا "اچھا ہوا آپ کو خدا نے اپنی نیت پر پکڑا ہے" وہ صاحب تو تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی سے اتر کر جہاں جانا تھا چلے گئے۔ مگر باباجی صاحب کی طبیعت پر میں نے بہت انقباض دیکھا۔ کچھ دیر بعد بڑے سنجیدہ اور ناراضگی کے لہجے میں مجھ سے پوچھا "آپ یہ اتنے طویل چلّے کس لئے کرتے ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ اپنی جان جلاتے ہیں" میں تو محض حیران ہی ہو رہا تھا اور کیا کہہ سکتا تھا۔ پھر خود ہی فرمانے لگے "آپ کو ابھی تک غصہ آتا ہے" پھر سختی سے فرمایا "دیکھو اگر ایمان کی ضرورت ہے تو کوئی گالی بھی دے تب بھی اس کے خلاف دل میں بھی ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ میں تو دم بخود ہو گیا۔ گذارش کی کہ آپ دعا کریں کہ ایسا ہی ہو۔

اصول تعاون کی ایک مثال

بہرحال تعاون اور عدم تعاون کے اسی خداوندی اصول پر ایمان کی وجہ سے میں ذاتی و سیاسی مخالفوں اور حکومتوں کے ساتھ کسی قسم کی دشمنی پر یقین نہیں رکھتا۔ حکومت جو کوئی بھی ہو اور وہ میرے مشوروں کو جو حیثیت دے، میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ چنانچہ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض قومی مفادات کے معاملات میں جو دراصل حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہیں، اتفاق رائے ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات تو بعض ایسے معاملات میں جن کا ذکر بھی اعلانیہ نہیں کیا جا سکتا، باہمی تعاون کی صورت بن جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ۱۹۶۵ء میں جنگ کے دوران خود اس جنگ کی ہی وجہ سے حکومت کے ساتھ نہایت قریبی تعاون کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ چنانچہ حکومت نے ایک خاص مقصد کے لئے خطیر رقم میرے

Marfat.com

حوالے کر رکھی تھی کہ اگر میں اس کا کوئی بھی حساب نہ دیتا تو بجا تھا اور اگر خدانخواستہ میری نیت خراب ہو جاتی اور میں خیانت کا مرتکب ہونا چاہتا تو کوئی مادی امر مانع نہیں تھا۔ لیکن یہ معاملہ محض میرے اور حکومت کے درمیان ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک تیسری قوّت بھی ہے جس کے ہاں حتمی اور آخری جوابدہی کرنا ہو گی۔ جنہوں نے مجھ پر اس طرح اعتماد کیا تھا ظاہر ہے کہ ان کو بھی شاید میرے بارے میں اسی قسم کا خیال ہوا ہو۔ اگرچہ اس کی پائی پائی کا حساب میں نے از خود بغیر کسی مطالبہ کے دے دیا۔ ایسے ہی بعض دوسری حکومتوں نے بھی میرے مشورے کی وجہ سے کئی اہم معاملات پر ضروری اخراجات برداشت کئے۔ کئی دوسرے مقامات پر نہایت دور رس معاملات میں بھی میرے مشوروں کو تسلیم کر لیا گیا' جبکہ حکومت کے اور میرے درمیان اس وقت بھی کوئی دوستی کی فضا قطعاً نہیں تھی۔ میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہوں کہ ملک کے محبّ وطن افراد کی رائے اور مشورہ ایک امانت ہے جو اس کے اہل کو دی جانی چاہئے۔ "اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اھلھا" (النساء ۵۸) (ترجمہ..... کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو دے دو) اور حکومت کا یہ حق ہے کہ وہ اس امانت کو وصول کرے اور اس پر جو مناسب سمجھے' کارروائی کرے۔ میں نے اس کو جائز نہیں سمجھا کہ ملک کا نقصان تو بے شک ہو مگر میری جھوٹی انا کو نقصان نہ پہنچے۔ ایسی انا میرے نزدیک ایک شیطانی وسوسہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس سے اگر کسی کم ظرف حکمران کو یہ احساس ہو کہ حکومت نے فلاں شخص کو خرید لیا ہے تو اسے اپنی عقل کا ماتم کرنا چاہئے۔ دراصل جس کے اندر خود جو کچھ ہوتا ہے' وہی وہ دوسرے کے بارے میں بھی سوچتا ہے۔ یہ طبعی اور فطری امر ہے۔ اس میں میرا قصور ہے نہ دوسروں کا۔ پھر یہ کہ کوئی شخص جو اس قابل ہے کہ حکومت کو کسی امر میں مشورہ دے اور وہ شخص ایسا نہیں کرتا تو وہ محض حسد و بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے جو بذاتہ اس دنیا میں ایک سزا ہے۔ وہ شخص اسی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مشورہ بھلائی اور خیر خواہی کا بھی حق ہے جو ادا کرنا چاہئے۔

کبرنفس اور تاب سخن

البتہ ایک مشکل اور بڑی مشکل' یہ پیش آتی ہے کہ جس طرح کہتے ہیں کہ "ہر شخص دوزخ کی آگ خود اپنے اندر ہی لئے پھرتا ہے' نہ کہ کسی نے علیحدہ اس کے لئے جلا کر رکھی ہوتی ہے" اسی طرح ہر شخص جب حکومت میں جاتا ہے تو وہ اپنا مزاج اور طبیعت بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ کئی حضرات کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اولاً تو کسی مشورہ کو ہی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کے احساس برتری کا نتیجہ ہوتا ہے جو اصل میں احساس کمتری کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ صرف اسی مشورہ کو درست سمجھتے ہیں جو ان کی اصلاح کے بجائے ان کی خرابی میں مددگار ہو۔ پروردگار عالم کا وہ ارشاد اس ضمن میں کتنا واضح ہے "وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ الخ" (ترجمہ..... اور ان لوگوں کو خوشخبری دیجئے

Marfat.com

جو بات سنتے ہیں اور اس میں سے اچھے حصے کی پیروی کرتے ہیں) یہ بھی ایک خصوصی حصہ ہے جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہے۔ اسی لئے اس پر خصوصیت کے ساتھ بشارت دی گئی ہے۔

اسی بات کے ضمن میں مجھے یاد ہے کہ ہمارے ایک وقت کے حاکم کے ایک دوست سے میں نے کہا کہ " بھائی آپ لوگ جوان کے ارد گرد ہیں ان کو کیوں نہیں بتاتے کہ یہ فلاں خرابی ہو رہی ہے " تو وہ برملا کہنے لگا " جب خود اس کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے تو ہم کیوں اس کے ساتھ تعلقات خراب کریں اور اپنے مفادات سے بھی محروم ہوں " وہ کہنے لگا " آپ نہیں جانتے وہ کوئی اچھی بات سننے کی تاب ہی نہیں رکھتا "۔ پھر اسی طرح ایک اور شخص کو دیکھا کہ وہ دراصل تو اس حکومت کا سخت مخالف تھا مگر بعض غلط امور میں ان کی بہت کھلم کھلا حمایت کرتا تھا۔ ایک بار اس سے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو کہنے لگا " یہ حکومت بے وقوف ہے، جو یہ سمجھتی ہے کہ میں ان کی حمایت کرتا ہوں۔ ان کی زبردست اور اصلی مخالفت تو میں ہی کرتا ہوں کہ ان کی بری باتوں میں ان کی حمایت کرتا ہوں "۔ اصل میں فطرت انسانی میں بھی یہ دو طبقے نمایاں ملتے ہیں جو محض کسی بری بات کو ہی حرف آخر سمجھتے ہوں۔ بعض کو تو دیکھا ہے کہ اگر ان کو معلوم بھی ہو گیا کہ فلاں بات غلط تھی تب بھی وہ اسی کو سچ ماننے پر مصر تھے بلکہ دوسری اطلاع کو غلط قرار دے رہے تھے اور دوسرے وہ جو اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس آیت مبارکہ میں خبر کی تحقیق کا حکم دیا گیا تاکہ توازن قائم رہے۔

خیر خواہی کا تقاضا اور اخلاقی جرأت

مگر مشکل جو بھی ہو، میری ہمیشہ کوشش یہ رہی کہ اپنی سمجھ کے مطابق حکومتوں کو مشورہ دیتا رہوں۔ میں نے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے کوئی دو مہینے بعد جبکہ فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم کے ساتھ مارشل لا کے نفاذ پر ہی اختلاف تھا اور اس زمانے کے ایک دن کا اختلاف آج کے سال بھر کے اختلاف سے زیادہ شدید تھا، ایک طویل خط لکھا تھا۔ اس میں میں نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ اس کا علاج کیا جائے اور میں نے خواہش کی تھی کہ اس بارے میں ان کے ساتھ بات کروں۔ مگر انہوں نے بھی وہی سمجھا جو تقریباً ہر ایک حکمران سمجھتا ہے کہ مقصد صرف ملاقات ہے، کیونکہ ان کے خیال میں شاید اس طرح لوگوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۸ء کے آخر میں یعنی پورے دس سال بعد اپنے وزیر امور کشمیر ایڈمرل اے آر خان کو میرے ساتھ بات کرنے کے لئے کہا۔ اسی طرح میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں بھی کئی صفحات پر مشتمل ایک خط لکھا تھا، جس میں میں نے اس آپریشن کا تجزیہ کیا تھا۔ مجھے چونکہ اس وقت پورے محاذ پر خود جانے کا اتفاق ہوا تھا، اس لئے میں نے اس خط میں کیا ہوا اور کیا نہ ہوا، وہ سب درج کیا تھا۔ البتہ کیا ہونا چاہئے تھا اس کا ذکر دانستہ چھوڑ دیا

Marfat.com

تھا۔ صدر صاحب نے جو پیغام دیا اس میں لکھا تھا کہ ابھی وقت ہے تو میں بتاؤں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ دوسرے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں ان کی خواہش تھی کہ میں اس وقت کے کمانڈر انچیف' وزیر خارجہ اور ایڈمرل اے آر خان کے ساتھ تفصیلی بات کروں کہ کیا ہونا چاہئے تھا۔ میں نے جواباً گذارش کی تھی کہ مشرقی پاکستان والا قصہ تو اب ختم ہو گیا ہے۔ وہ محض طریقہ کار اور وقت کا محتاج ہے۔ اس کی علیحدگی کو اب نہیں روکا جا سکتا۔ اس لئے اس پر کیوں وقت ضائع کیا جائے۔ رہی دوسری بات یعنی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں' تو میں نے ان سے گذارش کی تھی کہ اس میں کچھ دوررس قومی مفادات ہیں اور کچھ قومی راز ہیں جو مستقبل کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے میں نے ان سے یہ گذارش کی کہ کمانڈر انچیف کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن باقی دو حضرات جو وزراء ہیں ان کے ساتھ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے پوچھا "کیوں نہیں ہو سکتی؟" تو میں نے گذارش کی' ان دونوں حضرات یعنی وزیر خارجہ اور وزیر دفاع کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنے محب وطن ہیں اور کس لابی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے میں اتنی سنگین نوعیت کے معاملہ پر ان کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتا۔ ان کا یا کسی کا محض وزیر ہونا حب الوطنی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس پر ان کو برہم ہونا ہی تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں ان پر کوئی ذاتی حملہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ محض ایک اصولی بات کہہ رہا ہوں۔ اس وزیر خارجہ کے بارے میں تو میں نے چند اور امور کا بھی ذکر کیا جو ان دنوں زبان زد عام تھیں۔

ضمناً' اسی نشست میں میں نے ان کی توجہ ایک اور فوری امر کی جانب دلائی۔ میں نے کہا "ان معاملات کو چھوڑیئے۔ ابھی فوری طور پر ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ اس کے بارے میں سوچئے"۔ انہوں نے اپنی معلومات کا ذکر کیا تو میں نے پھر ان سے کہا کہ میں چونکہ عوام الناس میں رہتا ہوں اس لئے میری معلومات زیادہ صحیح ہیں اور یہ کہ عوام کا موڈ خراب ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس کو بھی ایک چیلنج سمجھا اور برہم ہو کر کہنے لگے "آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے پاس اتنی قوت ہے کہ ہم ایسی ہر تحریک کو کچل دیں گے"۔ میں نے اناللہ ...... پڑھا اور چلا آیا۔ منجملہ ان واقعات کی اپنی حیثیت کے کہنا یہ بھی ہے کہ جو شخص محض بکاؤ مال ہو اور جس کے اندر اپنا یقین وایمان کمزور ہو یا ہو ہی نہ' تو کیا وہ شخص ایسی گفتگو کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب بھٹو صاحب کی تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ چند ہفتوں میں وہ تحریک شروع ہو گئی۔

یہ باتیں اگرچہ سب اہم واقعات ہیں مگر بتانے کا مقصد یہ ہے کہ بہت ناموافق حالات میں بھی میں نے حکومتوں کو مشورہ دینے سے دریغ نہیں کیا اور یہ جو خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ماں باپ ان پر فدا ہوں نے فرمایا کہ "دین نصیحت ہے۔ مسلمانوں کے امام اور عام مسلمانوں کے لئے" تو اس کا بھی کچھ نہ کچھ مطلب یہی ہو گا۔ لفظ نصیحت کے جو معنی تقریباً بیشتر شارحین نے کئے ہیں وہ بھلائی' خیر خواہی' اخلاص اور وفاداری کے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمانوں کے امام (حاکم) کے ساتھ نصیحت یہ

Marfat.com

ہے کہ اس کو مفید اور مناسب مشورہ دیا جائے اور غلط کاموں سے روکنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ پروردگار عالم کے فضل و کرم سے میرا یہ طریقہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد مبارک کی ایک حد تک تعمیل بھی ہے۔ صرف یہ سمجھ کر بھی بیٹھے رہنا کہ حکمران کی غلطیوں کا بوجھ صرف اسی پر ہے' میرے خیال میں اس میں بھی بخل کا عنصر شامل ہے' یہ کسی کی اپنی عدم صلاحیت کا مظاہرہ ہے۔ حکمران عقلمند اور دانشمند ہوں تو خود مشورے طلب کرتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں' ورنہ مشورہ دینے والوں کو وہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ کچھ چڑیوں نے بارش کے دوران بندروں کو بلا طلب مشورہ دیا تھا کہ تم گھر کیوں نہیں بنا لیتے کہ بارش میں بھیگتے ہو تو بندروں نے گھر بنانے کے بجائے ان چڑیوں کے گھونسلے ہی اکھاڑ پھینکے تھے کہ اب دونوں ایک جیسے ہو گئے ہیں کیونکہ یکسانیت کا آسان طریقہ یہی ہو سکتا تھا۔ مگر یہ خطرہ ایسا ہے جو مول لینے کا سزاوار ہے۔

ذات باری پر غیر متزلزل یقین

سیاست ہو یا ذاتی معاملات' ابھی تک تو خدا کے فضل و کرم سے پورا ایمان ہے کہ میرا تمام نفع و نقصان' تکلیف و آرام اور عزت و ذلت سب ہی کچھ اسی پروردگار کی جانب سے ہے۔ نہ کوئی اس کو کم کر سکتا ہے نہ زیادہ۔ ہر بات کے لئے جو اسباب کی ظاہری ترکیب و ترتیب ہے' وہ بھی اسی کی مشیت سے بنتی رہتی ہے۔ اور میں آئے دن دیکھتا ہوں کہ کتنی ہی ایسی باتیں اور واقعات ہیں جو ہماری توقعات کے برعکس کم و بیش ہوتے یا بدلتے رہتے ہیں۔ اسباب کا تقاضا کچھ ہوتا ہے اور نتیجہ بالکل کچھ اور۔ میں تو اپنی قید و بند پر ہی جب غور کرتا ہوں تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں میرے لئے ذاتی مصلحت اور حکمت کے علاوہ قومی و ملکی حکمت کتنی ہے اور یہ کہ اس کا فاعل حقیقی بھی وہی پروردگار ہے۔ حکمران تو محض اس ملامت کے طوق کو ہی پہنتے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک واقعہ گذارش کروں۔

میری صدارت کے دوران دو تین بحران آئے۔ ایک خاموشی سے گذر گیا اور ایک ۱۹۷۵ء میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ درمیان میں ۱۹۷۳ء میں ایک بحران آیا تھا جو اخبارات کی زینت بھی بنا اور بالآخر ایک سمجھوتے یا مفاہمت کے طور پر ختم ہو گیا تھا۔ اس بحران کے دوران جب مرکزی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے گلگت لے جا کر قید کر دیا جائے تو اس وقت شیخ منظور الٰہی صاحب ہمارے چیف سیکرٹری تھے۔ شیخ صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ پریشان تو تھے ہی۔ الوداعی ملاقات کرنے آئے تھے۔ مگر ان کے علمی و فکری ذوق نے ایک سوال کرنے پر مجبور کیا۔ کہنے لگے "صحیح بتائیں کہ اس واقعہ کا آپ کے دل پر کیا اثر ہے"۔ میں اس وقت حسب عادت ایک تخت پوش پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجھے بھی اس کارروائی کا علم ہے۔ چند دنوں سے لگاتار میں گھیراؤ کی حالت میں تھا۔ ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ تھا۔

Marfat.com

جذبات آسمان پر تھے۔ مخالفین اچکنیں وغیرہ تیار کروا رہے تھے۔ جلسے جلوس اور شور شرابہ۔ پریذیڈنٹ ہاؤس باہر سے پولیس نے اور اندر سے ہمارے مشتعل کارکنوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ایسی حالت تھی کہ معمولی سی غلطی سے سینکڑوں جانیں ضائع ہو سکتی تھیں۔ میں نے کہا "کیا آپ یقین کریں گے جو کچھ میں کہوں گا" کہنے لگے "بالکل" میں نے کہا "شیخ صاحب! اس پورے واقعہ کا میرے دل پر ایک پر کاہ کے برابر بھی اثر نہیں ہے" کہنے لگے "یہ کیسے ممکن ہے"۔ میں نے کہا "ایسے کہ میرا اس پر مکمل ایمان ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے یہاں رکھنا چاہتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ میری بہتری اسی میں ہے بلکہ دنیا ساری مل کر اس کے خلاف نہیں کر سکتی اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں چلا جاؤں تو میری بہتری بھی اسی میں ہے بلکہ ساری دنیا مل کر مجھے یہاں نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہو سکتی"۔ معلوم نہیں ان کو صحیح اطمینان ہوا یا نہیں' البتہ میں تو وہیں رہا۔ مگر ان کو سزا کے طور پر ملازمت سے ہی سبکدوش کر دیا گیا۔ برخاست یا فارغ یا ریٹائرڈ کر دیا گیا' اس کا تو مجھے صحیح علم نہیں۔ اس واقعہ سے بھی اندازہ ہو گا کہ میرا یہ سیاسی طرز فکر کیسا ہے اور کیسے نبھ رہا ہے۔

باصلاحیت ملازمین کے ساتھ مرکزی حکومت کا سلوک

شیخ منظور الٰہی صاحب سے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ہمارے اعلیٰ دماغ ملازمین کے ساتھ ہماری حکومتیں کیا کیا "احسان" نہیں کرتی رہیں۔ شیخ صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت معروف شخصیت ہیں اور اپنے اعلیٰ کردار اور صلابت رائے کے باعث تمام دوستوں میں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ شیخ صاحب کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ایسا شخص کس خوشی میں سروسز میں داخل ہوا تھا۔ سروسز کی جو بھی حالت ہو' خواہ اچھی سے اچھی کیوں نہ ہو' اس میں حدود و قیود کچھ متوقع اور کچھ غیر متوقع' کچھ محسوس اور کچھ غیر محسوس ایسی ہوتی ہیں کہ وہ علم و فکر کے آزاد راہ رو کے لئے زبردست رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اسے علم و فکر کی ہی باگیں کھینچنا پڑتی ہے۔ اقبال کے شعر کے معنی اگرچہ وسیع تر ہیں مگر غالباً یہ بھی ہیں جو انہوں نے کہا "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" علم و فکر تو کسی حد کو تسلیم ہی نہیں کرتے جبکہ ملازمت تو نام ہی حدود و قیود کا ہے ہمارے کئی لوگ اس کشمکش کی بھی نذر ہو گئے ہوں گے۔ ہمارے یہ دو تین چیف سیکرٹری تو قابل فخر تھے۔ میرے دور میں یہاں اور بھی کچھ نہایت ہی اچھے افسر صاحبان رہے ہیں اگرچہ نسبتاً تعداد میں کم ہی سہی۔ ہمارا وہ دور حکومت نہ صرف جمہوریت اور دوسری معروف امتیازی خصوصیات کا حامل تھا بلکہ ان دنوں ہمارے ہاں مرکز سے جو چند سرکاری افسر آئے تو وہ اپنے دور کے نہایت قابل عزت' سینئر اور اعلیٰ درجے کے لوگ تھے ان میں چیف سیکرٹریوں کے علاوہ سردار حبیب خان اور سید حبیب خان بھی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ شیخ منظور الٰہی

Marfat.com

صاحب اور اجلال حیدر زیدی تو چیف سیکرٹری تھے۔ میرا یقین ہے کہ آزاد کشمیر کے لوگ اب تک ان کو نیک نامی سے یاد کرتے ہیں بلکہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ کوئی بھی حکومت ان پر فخر کر سکتی ہے۔ حسن ظہیر بھی چیف سیکرٹری ہو کر آئے تھے۔ مگر وہ میرے بعد چیف سیکرٹری رہے۔ حسن ظہیر بھی اسی اعلیٰ گروہ کے فرد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ملک وملت کی مزید خدمت کرنے کی توفیق عطا کرے اور ان کو نظر بد سے بھی بچائے۔ اجلال حیدر زیدی کو تو اس بنیادی بات کا شدت سے احساس تھا کہ پالیسی سازی کا کام صرف سربراہوں کا ہے۔ انتظامیہ کو محض احسن طریقہ سے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ ان کا تبادلہ بھی یہاں سے محض اسی لئے ہوا تھا کہ وہ بے جا مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ اس کام کے لئے اوپر سے بہت کھلے اشارے ہو رہے تھے۔ انہیں ملازمت سے نکالا تو نہ گیا مگر ایک عرصہ تک انہیں عام اصطلاح میں "کھڈے" لگا دیا گیا تھا۔ جس طرح ان کا تقریباً ہم نام جانشین صرف برائی پر ہی قادر تھا وہ صرف اچھائی پر ہی قادر تھے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی نیک صلاحیتوں ' ایمان اور یقین میں اضافہ فرمائے۔ ان دوسرے صاحب کا نام اجلال حسین تھا جبکہ اول الذکر اجلال حیدر زیدی تھے۔ ان دوسرے صاحب سے بھی ہماری اب کوئی ناراضگی نہیں ہے۔ اللہ ان کو بھی معاف فرمائے۔ یہ توضیح اس لئے کی کہ اجلال حسین کے نام کے ساتھ بدقسمتی سے زیدی کا لفظ غلط طور پر استعمال ہونے لگا تھا جبکہ وہ زیدی نہیں تھے اور یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کون سا اجلال زیدی ہے۔ بلکہ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اجلال حیدر زیدی کی عمدہ شخصیت پر اس دوسرے اجلال کی برائیوں کی چھاپ لگ رہی تھی۔ اگر وہ دور کچھ اور دیر رہتا تو اجلال حیدر زیدی کو شاید اپنے نام سے زیدی کو ترک کرنا پڑتا۔

ملک وقوم پر ظلم عظیم

ہمارے ناعاقبت اندیش ' تنگ ظرف ' نا تجربہ کار اور احساس کمتری میں مبتلا بعض حکمرانوں نے بلکہ اکثر نے اس ملک کے ساتھ جو بیدردی اور برائی کی ' اس میں ایک بڑی اور فاش برائی یہ تھی کہ سرکاری مشینری کو اپنی ذاتی اغراض کا نشانہ بنایا۔ ان کو ان کے فرض منصبی سے ہٹا کر سیاسی کاموں میں مصروف کر دیا اور سیاست جیسا کہ میں نے کہا ایسا زہر ہے جس کا کوئی علاج نہیں اور ایک ایسا مرض ہے کہ جس کو لگ جائے تو پھر بڑے امراض کی طرح کسی دوسرے مرض کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا۔ جو ملازم سیاست پر لگ گئے ان کو اپنا منصبی فریضہ یاد ہی نہیں رہا۔ وہ سوتے جاگتے سیاست کی ہی بات کرتے ہیں۔ کوئی بدترین جرم اگر ہمارے حکمرانوں نے کیا ہے تو وہ یہی ہے جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ حکومت اگر ان ملازمین سے سیاسی کام نہ لے تو وہ خود بخود اسی حکومت کے خلاف سیاسی سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب کمشنر ' ڈی سی ' ایس پی اور دوسرے محکموں کے سربراہ سیاسی کاموں پر لگ جائیں تو پھر

Marfat.com

باقی کیا رہا۔ ان کو وقت کب ملے گا کہ وہ اپنا قانونی فرض پورا کریں۔ پھر سیاست بھی کوئی قومی یا ملکی یا ملّی سیاست نہیں بلکہ محض گروہی اور دھڑے بندی کی سازشی سیاست۔ عملاً تو اب یہ صورت ہے کہ جس طرح سیاسی لیڈروں کی پارٹیاں ہیں اسی طرح بلکہ اس سے بہتر طور پر سرکاری ملازمین کی بھی پارٹیاں ہیں۔ سروسز کے اندر بھی اور باہر بھی۔ اس قصے میں بھی جب انتظامی افسروں سے بڑھ کر بات سیکرٹری صاحبان تک پہنچ جائے تو پھر انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ سیکرٹریوں کا کام بے حد نازک اور مقدس امانت کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن جب ان کو بھی پالیسی بناتے وقت اپنے فرض کا نہیں، صرف سیاسی مفادات کا خیال رکھنا پڑے تو پھر پوری حکومت میں کوئی ایک فرد بھی باقی نہیں رہتا جو توازن اور اعتدال کی راہ پر چل سکے۔ خاص کر جب انتخابات میں سرکاری مشینری کو ملوث کیا جاتا ہے وہ تو نا قابل معافی جرم ہے اور اس کا نقصان بھی نا قابل تلافی۔ ایسی مشینری سے پھر اگر کوئی شخص انصاف، عدل اور نظم وضبط کا تقاضا کرے تو یہ محض حماقت ہے۔ سرکاری مشینری کو انتخابات میں ملوث کرنے کا قابل فخر کام کوئی آج کل کا نہیں ہے۔ پاکستان کے سب سے پہلے انتخابات میں جو ہوا تھا بعد کی سب دھاندلیاں اس کے سامنے ماند ہیں۔ ایسے ماحول میں عدلیہ کیسے فرشتوں کی طرح ہو سکتی ہے کہ ان پر کوئی اثر نہ ہو۔ عدلیہ کا احترام صحیح بات کہنے میں مانع ہے۔ ہمارے مولانا عبد العزیز تھوراڑوی ایک مثال دیتے رہتے ہیں۔ کسی شخص کا گندم کا کھلیان رات کو آندھی اور ہوا نے دانہ دانہ کر کے بکھیر دیا۔ صبح اس نے دیکھا تو کہا خدایا تجھ سے ڈر لگتا ہے ورنہ میں کہتا کہ ایسا تو بچے بھی نہیں کرتے۔

ہم سفروں کے ساتھ تعلقات

سیاست کے ایک اور عملی پہلو کے بارے میں بھی کچھ گذارش کروں۔ وہ ہے اپنے ہم سفروں، ساتھیوں، رفیقوں اور دوستوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت۔ اگرچہ اس کو ہمارے ہاں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی مگر میں سمجھتا ہوں کہ انسانی زندگی کا یہ وہ گوشہ ہے جو انسانی کردار کے کئی باریک پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ اس کی کچھ وضاحت کے لئے ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں نظر بند تھا تو ایک دن میجر اورنگ زیب میرے پاس آئے اور ان مسلم کانفرنسی کارکنوں کا ذکر چلا جن کو دلائی کیمپ میں بند کر کے ان کے ساتھ وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا تھا۔ ضمناً یہ سب لوگ ہماری جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے سرکردہ اور صف اول کے حضرات تھے اور یوں بھی اپنے معاشرے میں عزت کا مقام رکھتے ہیں۔ میجر صاحب نے تھوڑی گپ شپ کے بعد کہا "سردار صاحب یہ سب لوگ ایسے نہیں ہیں جن کے لئے آپ ہم سے ناراض ہوتے ہیں" میں نے پوچھا "کیوں، کیا ہوا" تو انہوں نے کہا "یہ لوگ آپ کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں وہ آپ کو معلوم نہیں ہے" میں تو اس کی بات پوری

Marfat.com

سمجھ گیا مگر وہ حکومت کے نشے میں یہ نہ سمجھا کہ مجھے اس کی بات کا علم ہو گیا ہے۔ میں نے کچھ تجاہل سے کام لے کر مزید پوچھا تو کہا کہ "کیا میں آپ کو وہ سب کچھ سناؤں جو وہ کہتے ہیں، میں وہ سب ٹیپیں اور فائلیں ساتھ لایا ہوں" میں نے پوچھا "انہوں نے میرے خلاف باتیں کی ہوں گی" کہنے لگا "کچھ باتیں کی ہیں؟ چاہیں تو میں وہ ٹیپیں آپ کو سناؤں اور وہ بیانات آپ کو دکھاؤں" میں نے دوبارہ پوچھا "میجر صاحب انہوں نے پاکستان یا نظریہ الحاق پاکستان کے خلاف بھی بہت کچھ کہا ہو گا جلدی سے جواب دیا "نہیں نہیں۔ اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا" میں نے کہا "سنیئے میجر صاحب بس میرا اور ان کارکنوں کا تعلق صرف اسی عقیدے اور نظریئے پر ہے۔ کسی ذاتی وفاداری یا جماعت کی بنیاد پر نہیں ہے" وہ کھسیانہ سا ہو گیا اور بے چارہ پھر کچھ نہ کہہ سکا۔ جب اس نے تلخیاں کم کرنے کے بارہ میں بات کی تو میں نے کہا "دیکھئے میجر صاحب! آپ کا جو بھی عہدہ ہو، مگر ہم سب اس ملک کے شہری تو ہیں اور اسی میں ہم نے رہنا ہے۔ مجھے ایمانداری سے بتایئے کہ یہ جو کچھ آپ لوگ آزاد کشمیر میں اس وقت کر رہے ہیں، کیا یہ پاکستان کے مفاد میں ہے؟" تھوڑی دیر بعد کہنے لگا "یہ تو میں مانتا ہوں کہ نہیں ہے" میں نے کہا "بس یہی آپ کے اور ہمارے درمیان اختلاف کی وجہ ہے۔ اس کو درست کر دو تو پھر اختلاف کا دائرہ خود بخود بہت بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے"۔

اس مثال سے یہ بات سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ ہمارے پورے سیاسی فکر کی بنیاد ملکی و قومی مفادات ہیں اور تمام تر وفاداریاں اللہ اور اس کے حبیب صلعم کے بعد اسی مقصد کے ساتھ ہیں اور وہی تمام اچھے یا برے تعلقات کی بنیاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بڑے سے بڑے حاکم سے اختلاف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور جب ان مقاصد کا تقاضا ہو تو اتفاق کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ذاتی تعلقات کے بارے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ میں کسی دوست سے ذاتی وفاداری کا دل میں بھی تقاضا نہیں کرتا کیونکہ میں اس کے اہل نہیں اور خود کو اس کا مستحق نہیں سمجھتا البتہ میں خود کو اس امر کا مکلّف جانتا ہوں کہ دوستوں کے ساتھ میری وفاداری درست اور قائم رہنا چاہئے۔ وہ اپنے عمل کے لئے جواب دہ ہیں اور میں اپنے عمل کے لئے پھر یہ کہ وفاداری ایک ایسا قیمتی جوہر ہے جس کا ہر شخص مکلّف نہیں ہے اور جس میں یہ جوہر موجود ہو گا اس سے تقاضا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی ایک بنیادی وجہ ہے کہ ہماری یہ جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس بغیر کسی مادی سرمایہ کے اب نصف صدی سے نہ صرف چل رہی ہے بلکہ خدا کے فضل و کرم سے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی دوسری سیاسی جماعت ہو۔ اخلاص مند اور وفاشعار کارکنوں کی تعداد سے ہمیں کبھی شکایت نہ ہوئی۔ خدائے پاک کا ہم سب پر کرم ہے ورنہ اخلاص مندی اور وفاشعاری کسی مدرسے، کالج یا مشین سے تو پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ایک عطیہ ہے پروردگار عالم کا، جو اس قوم کے حصے میں آیا ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ حَمْدًا كَثِيْرًا۔

Marfat.com

اپنوں اور غیروں دونوں سے عفوودر گذر

اسی طرح اس کے دوسرے پہلو کے بارے میں بھی اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ صرف دوستی کی حالت میں ہی نہیں بلکہ سیاسی لڑائی ہو یا گرم جنگ ہر صورت میں بعض قاعدوں کی پابندی کی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس میں بھی اپنے خیال کے مطابق کوئی خاص ناکامی نہیں ہوئی۔ اس پہلو میں انتقامی کارروائی کو بہت اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن خدائے تعالٰی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ طاقت ہوتے ہوئے بھی کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اللہ تعالٰی نے مجھے اس آلائش سے بھی پاک رکھا ہے۔ ایسی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے میرے اس خیال کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔ایسے کئی مواقع آئے کہ میرے ساتھ لوگوں نے بے حد بدسلوکی کی اور پھر خدا نے مجھے ایسا مقام عطا کیا کہ میں ان سے پورا انتقام لے سکتا تھا' بلکہ ان کی تباہی کا باعث ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو محض میری طرف سے چشم پوشی ہی ان لوگوں کی تباہی کا سامان ہو سکتی تھی۔ لیکن پروردگار عالم نے اس کے برعکس مجھے ہمت دی کہ میں نے نہ صرف ان کو معاف کر دیا بلکہ ان کی دیکھ بھال اور امداد کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی۔ کسی سے بدلہ یا انتقام نہ لینا بھی طبیعت کا ایک خاص پہلو ہے۔ جس طرح انتقام لینا طبیعت انسانی کا حصہ ہے' اسی طرح میرا خیال ہے کہ انتقام نہ لینا بھی طبیعت انسانی کا حصہ ہونا چاہئے۔ میرا یہ جذبہ تو ایسی حد کو پہنچا ہوا ہے کہ جب میں بہتر پوزیشن میں ہوں اور کوئی مخالف میرے سامنے آ جائے تو الٹا میں خود شرمندہ ہوتا رہتا ہوں۔ تاہم کبھی کبھی میں اس کیفیت کے لئے اپنی گفتگو میں دلائل بھی دیتا ہوں۔ وہ دلائل اگرچہ اس کیفیت کا باعث نہیں ہیں مگر وہ اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ میں کسی پر اپنی ذاتی وفاداری کا حق نہیں سمجھتا اس لئے اگر کوئی مخالفت کرتا ہے تو مجھے اس کا کوئی رنج نہیں ہوتا۔ مخالفت کا تو ویسے بھی رنج نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن دوستوں کی مخالفت کا رنج اس لئے نہیں ہوتا کہ اس نے گویا اپنا حق خود ہی ترک کر دیا۔ بلکہ ایسی صورت میں تو بسا اوقات میرا قلبی بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور میں اس کو دعائیں دیتا ہوں کہ اس نے اگر مجھ پر کوئی احسان کیا تھا تو خود ہی اس کو واپس لے لیا۔ اس کے علاوہ ایک خیال یہ بھی ہے اور ان کو بھی عملاً بہت آزمایا ہے کہ اللہ تعالٰی خود بخود مدافعت فرماتے ہیں بلکہ جو انتقام وہ لیتے ہیں اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ایمان کا تو کوئی خاص دعویٰ نہیں لیکن خود کو ایمان سے خالی بھی کیوں سمجھیں اور بلاوجہ خدا کی رحمت سے مایوس ونامراد ہوں۔ اللہ تعالٰی کا بھی ارشاد ہے۔" اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ" (خدائے پاک نے کس طرح اپنے اس کمترین بندہ کی مدافعت کی اور اس کا بدلہ لیا اسی نعمت خداوندی کا شکر ادا نہیں ہو سکتا) اگر وہی گنوائی جائے تو ایک کتاب درکار ہے۔ پھر میرا اس پر بھی ایمان رہا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول علیہ السلام درگذر اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کا بھی ایک سے زیادہ مقامات پر تذکرہ ہے۔ لِمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ

Marfat.com

وسلم کے تو اس ضمن میں کئی ارشادات مبارکہ ہیں۔ خدا ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے۔

اس کیفیت کا ایک اور عقلی سبب بھی میرے دل و دماغ پر سوار رہا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک طرف ہم مسلمانوں پر دنیا بھر کی طرف سے پورے مادی وسائل اور عقلی و فکری اسباب کے ان گنت لشکروں کے ساتھ یلغار ہو رہی تو دوسری طرف اگر ہم اپنی طاقت کو ایک دوسرے کے خلاف ہی استعمال کرتے رہیں گے تو انسانی قوّت کا سرچشمہ تو بہرحال محدود ہے۔ دشمن کے خلاف کیا استعمال کریں گے۔ مجھے ہمیشہ احساس تھا کہ اس ملّت کا کوئی نقصان باہر سے نہیں ہو سکتا' صرف اس کے اندر سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ دشمن بھی اس سے باخبر ہے۔ اسی لئے وہ ہمارے درمیان فساد پیدا کرنے اور اس کو پھیلانے پر بھی بے پناہ زور و زر صرف کرتا ہے۔ تو کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے مابین ایسے اختلافات سے گریز کریں جن کا لازمی نتیجہ دشمنی ہے۔ آخر وہ ارشاد خداوندی کیا ہوا "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ" (ترجمہ..... اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں رحمدل ہیں)۔

انسان کے فطری جذبہ کا تقاضا تو محض یہی ہے کہ اگر لوگ آپس میں مہربان ہوں گے تو غصہ و ناراضگی کا نشانہ دشمن ہو گا اور اگر آپس میں دشمنی ہو گی تو مہربانی کا سلوک دشمن کے ساتھ خواہی نخواہی کرنا ہی پڑے گا۔ کیا آج ہماری مثال ساری دنیا میں یہی نہیں ہے؟ اور یہ کتنی نامرادی ہے۔

دشمن کے خلاف مؤقف

بھارت کے ساتھ جب دوستی کی باتیں ہوتی ہیں تو میں حیران ہوتا ہوں کہ کیا ہمارے خون سرد ہو گئے ہیں۔ کیا ہماری غیرت و حمیّت مر گئی ہے۔ کیا ہمارے احساسات و جذبات فنا ہو گئے ہیں۔ کیا ہماری عقل و فکر پر موٹے پردے پڑ گئے ہیں' کیا وہ حرارت ایمانی کی کوئی ایک چنگاری بھی اس تنِ لاغر میں باقی نہیں رہی۔ "بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے"۔ ایک طرف تو سال بہ سال' ماہ بہ ماہ' ہفتہ بہ ہفتہ' روز و بروز ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا ناحق خون بہہ رہا ہو بلکہ بہایا جا رہا ہو۔ پھر جو حکومت خود ایسا کروا رہی ہو' ہم اسی کے ساتھ دوستی کرنے کے لئے بیتاب ہو رہے ہوں۔ ہماری غیرت و حمیّت کی بربادی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو گی کہ لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کا قاتل اول واجپائی بھارت کا وزیر خارجہ ہو کر جب یہاں آیا تو ہمارے کئی "باحمیّت" لوگ اس سے مغفرت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے پروانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے۔ کوئی آٹوگراف لے رہا ہے تو کوئی تعارف کروا رہا ہے اور کوئی اس کے ساتھ تصویر اتروا رہا ہے۔

ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

جواہر لال نہرو جب یہاں آیا تو کتنے لوگ تھے جو اس کے استقبال کے لئے بچھے جا

Marfat.com

رہے تھے، نہ غیرت کا پاس، نہ حمیت کا احساس و شعور، وہاں بھی رئیس الاحرار چوہدری غلام عباس مرحوم اور ان کے ہم ٹوٹے پھوٹے ساتھیوں کی ہی غیرت کام آئی اور ہم نے فیلڈ مارشل ایوب خان (مرحوم) کو بتایا کہ پنڈی میں اگر کسی نے نہرو کا استقبال کیا تو ہم نہرو کے خلاف مظاہرہ کریں گے۔ اگر ہم آج اپنی بے تدبیری اور حماقتوں کے باعث کمزور ہیں تو ہوں مگر بے غیرت ہونے کا تو کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھی عین وہی ہے کہ ہم اس عظیم حکمت خداوندی کی نافرمانی اور اس کی مخالفت کر رہے ہیں جس کی وجہ سے خود فطرت نے ہی ہم پر ذلّت مسلط کر دی ہے۔ آج اگر ہم آپس میں دست و گریبان ہونا عارضی طور پر ہی ترک کر دیں تو بھارتی رہنما اور حکومت ہمارے حکمرانوں کے قدموں میں کھڑا ہونا فخر سمجھنے لگیں۔ ہمارا یہ انتشار و افتراق اور غیروں سے دوستی، جس سے خدا نے بار بار منع فرمایا، ہمارا اشعار بن گیا ہے اور ہمارے لئے باعث ذلّت و رسوائی بھی۔ باہمی تعاون اور اگر اتحاد نہ ہو سکے تو ممکنہ حد تک اتفاق رائے کے بارے میں میرے خیالات کی بنیاد ان ہی امور پر ہے۔ غیروں کو اگر ملت اسلامیہ سے کسی ایک بات کا ڈر اور خوف ہے تو وہ اس ملت کا اتحاد ہے، کوئی دوسری بات نہیں ہے۔

اظہار رائے کی آزادی

سیاست میں کلّی اتحاد تو محض اتفاقیہ ہو سکتا ہے، عادت یا روزمرّہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ سیاسیات میں خود اتنا تنوّع ہے کہ بیک وقت کئی مخالف قوتیں متحارب بھی ہوں تو ناجائز نہ ہوگا اور یہی ہماری تاریخ کا بڑا المیہ ہے تاہم اگر ہم لوگ وقت کے مخالف تقاضے اپنے پیش نظر رکھیں اور ذاتی انا کو تھوڑی دیر کے لئے ملکی و ملی مفادات پر ترجیح نہ دیں تو ہر دور میں ایک ادنیٰ قدر مشترک پر زیادہ یا تھوڑی دیر کے لئے اتفاق رائے بہر صورت ہو سکتا ہے۔ بلکہ اگر ہم صرف اتنا ہی کر دیں کہ اپنی بات جس قدر چاہیں شدومد سے اور زور استدلال سے بیان کریں مگر دوسروں کو دشمن نہ سمجھیں اور ان کو بھی اظہار رائے کا حق دیں، تو ہمارے بیشتر معاملات درست ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ انتشار و افتراق اب اخلاص مندی کی حدود سے بہت آگے نکل کر محض پیشہ وری اور ایک نفع بخش تجارت یا کاروبار بن گیا ہے۔ اللہ ہم کو اس سے بچائے۔

رائے کی آزادی بھی ایک عظیم نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کا مجھ پر یہ احسان بھی ہے کہ اس نے مجھے رائے کی آزادی بھی عطا فرمائی ہے۔ یہ بے بہا دولت بھی بآسانی ہاتھ نہیں آتی اور اگر آ جائے تو اس کی حفاظت بے حد مشکل ہو جاتی ہے۔ قدم قدم پر اس کے لئے پھندے لگے ہوئے ہوتے ہیں، وہ جو مولائے روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

Marfat.com

(ترجمہ..... جب غرض پیش نظر ہو تو خوبی پوشیدہ ہو جاتی ہے اور سینکڑوں پردے دل سے آنکھ تک پہنچ جاتے ہیں)

رائے اگر آزاد ہو بھی جائے تو اس کے اظہار پر پابندی یار کاوٹ یا حجاب کے باعث وہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ بلکہ اپنے صاحب کے لئے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ پھر یہ نادر شے دو دھاری تلوار ہے یا سونے کا خنجر ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجرد ذہانت ہے۔ اگر اس میں عقیدہ و ایمان شامل ہوں تو وہ ایک گرانمایہ دولت ہے، عین دانشمندی ہے اور سلامتی کی ضمانت ہے۔ مگر وہ نہ ہو تو حلال حرام دونوں پر چلنے والی چھری ہے بلکہ ایسی چھری تو اکثر حرام پر ہی چلے گی۔

تو میں بات رائے کی آزادی، اس کے آزادانہ اظہار اور اس پر پورے عزم و یقین کے ساتھ عمل کرنے کی خدائی کرم نوازی اور احسان عظیم کی کر رہا تھا کہ اگر اگست ۱۹۴۷ء میں ہماری فکر آزاد نہ ہوتی اور ہم آزادی سے اس کا اظہار نہ کر پاتے اور پورے عزم کے ساتھ اس پر عمل پیرا نہ ہوتے جو آج ہم پاکستان کی اس آخری دفاعی سرحد آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات جن کی وجہ سے چین کی ہمسائیگی کا بھی استفادہ ہو رہا ہے، دونوں سے محروم ہوتے اور بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی اور مغربی پاکستان کا علاقہ خدانخواستہ خود بخود ہی دم گھٹ کر رہ جاتا۔ اس عظیم تاریخی بلکہ تاریخ ساز واقعہ نے ہی انگریز اور ہندو لیڈروں کی ملی بھگت کی اس سازش کو بڑی حد تک ناکام کر دیا جو پاکستان کے حصے کی فوج اور اسلحہ کو پورے ہندوستان میں بکھیرنے میں مضمر تھی اور جس سازش کا دوسرا حصہ وہ شرمناک تاریخی بددیانتی 'ریڈکلف ایوارڈ' تھا۔

نازک مرحلہ...... گنگا کا اغوا

رائے کی آزادی بھی کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ خاص کر جب اس کا اظہار بھی اسی طرح ہو اور اس پر عمل بھی۔ چنانچہ یہی وہ مجبوری تھی جس نے مجھے عین اس وقت اس طوفان میں کودنے پر مجبور کر دیا تھا جب پوری پاکستانی قوم باہر نکل آئی تھی اور بھارت سے لائے جانے والے "گنگا" ایک ڈکوٹہ جہاز کی دم پر نظریں لگائے ہوئے تھی کہ اس کے ساتھ بندھا ہوا کشمیر جو آ رہا تھا وہ کدھر چلا گیا۔ لوگوں کا خیال یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کشمیر اس جہاز کی دم کے ساتھ آ رہا تھا، مگر سردار قیوم نے اسے گنوا دیا۔ اس لئے ہر شخص مجھے قابل گردن زدنی سمجھتا تھا۔ لاہور میں جلوسوں میں نعرے لگائے جا رہے تھے کہ سردار قیوم کا سر چاہیئے۔ اخبارات نے میرے خلاف اڈیٹوریل لکھے۔ بڑے بڑے دانشوروں نے مجھے گالیاں دیں۔ جنرل سرفراز جیسے سنجیدہ آدمی نے بھی انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سوائے یحییٰ خان کے پوری حکومت مجھے دشمن قرار دے رہی تھی۔ میری جماعت کے کارکنوں نے بھی میرے خلاف جلوس نکالے۔ غرض کیا

Marfat.com

کچھ نہیں ہوا۔ وہ تفصیل تو اس وقت بیان نہیں ہو سکتی مگر اتنا بتانا ضروری ہے کہ میرے پیش نظر حقیقت میں کیا بات تھی۔ ظاہر ہے کوئی ایک بات تو نہ ہو گی مگر سب کو بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ بنیادی طور پر میرے پیش نظر اسی ملک کا مفاد اور خود کشمیریوں کا مفاد تھا۔ اس ملک کا مفاد یہ تھا کہ ہم بھارت کے ساتھ کوئی غیر محدود خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتے۔ ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہئے کہ اگر ہمارا نقصان "ایک" ہو تو دشمن کا نقصان "دس" ہو۔ تب تو ہم صرف برابر برابر رہ سکتے ہیں کیونکہ ہمارے مابین طاقت کا تناسب یہی ہے۔ لیکن اگر ہم کسی خوش فہمی کے باعث ایسا کام کریں جس سے یہ تناسب الٹا ہو جائے یعنی ہمارا نقصان "دس" اور دشمن کا "ایک" ہو تو پھر ظاہر ہے کہ ہم نے گویا خودکشی کر لی۔ اس جہاز والے واقعہ میں بالکل یہی تناسب ظاہر و باہر تھا۔ اس لئے اگر اس فعل کو کلیتہً جذبہ آزادی' حب الوطنی اور اسلامی پسندی پر مبنی قرار دیا جاتا تب بھی میرے نزدیک یہ ناقابل معافی جرم تھا۔ کیونکہ یہ محض خودکشی تھی، کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ پوری قوم کی۔

یہ بھی محض اتفاق ہے کہ اس واقعہ سے ہفتہ عشرہ قبل لاہور میں نوجوانوں کا ایک وفد مجھ سے ملا۔ یہ لوگ بھی کشمیر کے نام پر بھارت کا کوئی جہاز ہائی جیک کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ میں نے ان سے بالکل یہی بات کہی تھی۔ ان کو یہ بتایا تھا کہ بھارت کا محض ایک جہاز اغوا کرنے سے کس طرح ہمارا رشتہ مشرقی پاکستان سے کٹ جائے گا اور اس کے کٹنے سے بھارت کے ناپاک عزائم کی کس طرح تکمیل ہو گی۔ اس کے علاوہ محض پی آئی اے کی پروازیں بند ہونے سے کس طرح روزانہ کروڑوں روپے کا قومی نقصان ہو گا اور کس طرح ہماری تمام پروازیں جو دوسرے ملکوں کو جاتی ہیں بند ہو جائیں گی اور اگر بھارت نے جواباً محض جہاز ہائی جیک کرنے کا ہی پروگرام بنالیا تو ہمارا تناسب کیا ہو گا اور کیا ہم محض ایک جہاز کی خاطر یا نوجوانوں کے شوق کی خاطر ایسا خطرناک اور تباہ کن کھیل کھیل سکتے ہیں۔ پھر میں نے یہ بھی بتایا کہ کیا اس طرح کشمیر ہمیں مل جائے گا؟ اگر مل جائے تب بھی میں یہ مشورہ نہیں دوں گا۔ وہ نوجوان بے چارے یہ سب کچھ سن کر ہکے بکے ہو گئے اور میرا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ میری یہ رائے گنگا کے اغوا ہونے کے بعد نہیں بنی تھی بلکہ بہت پہلے سے تھی۔ میں نے خود کئی بار اس پر سوچا تھا اور میرے لئے یہ نہایت آسان کام تھا مگر اسی حکمت عملی نے جس کا میں نے ذکر کیا' آڑے آ رہی تھی اور ہمیں اس خطرناک کھیل سے باز رکھا بلکہ میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی ایسی حماقت سے دور رکھا۔ اسی گنگا کو اغوا کرنے والوں کی ٹیم میں شامل ہونے سے بھی ایک معروف سیاسی کارکن کو تقریباً ایک سال پہلے سختی سے منع کیا تھا ورنہ وہ تو محض مہم جوئی کی نذر ہو جاتا۔

Marfat.com

تحریک آزادی کے معقول راستے

کشمیریوں کے مفاد کی بات آئی تو میں بتادوں کہ وہ بھی ایک سوچی سمجھی بات اور تاریخی عمل کا ناقابل تردید حصہ ہے۔ آزادی کی جو بھی تحریکیں چلی ہیں وہ زیادہ تر دو ہی قسم کی ہیں۔ محض سیاسی، جس طرح ہندوستان کی آزادی کی تحریک تھی اور دوسری سیاسی و فوجی ملی جلی۔ جس کی بے شمار مثالیں حال ہی میں ملتی ہیں۔ دونوں قسم کی تحریکوں کے لئے بالعموم اور دوسری کے لئے بالخصوص اس ملک سے باہر کسی محفوظ مقام کی پناہ لازمی ہے اس لئے ایسی تحریک کے کارکنوں کا تعلق اس جائے پناہ کے ساتھ خود اپنے ہی وطن عزیز کی طرح مقدّس اور عزیز ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ کیونکہ اگر اس کے برعکس ہو یعنی وہ اس جائے پناہ کے ساتھ محبت والفت نہ رکھیں بلکہ مخالفت کریں تو اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی کہ کوئی شخص درخت کی ٹہنی پر آگے بیٹھا ہو اور اسی کو تنے کے قریب سے کاٹ رہا ہو۔ اس احمق کا کیا حشر ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ پھر یہ کہ یہ تو ایک طرح کی منافقت بھی ہے اور منافق لوگ کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ آزادی کی تحریک کی حکمت عملی کے بھی بالکل خلاف ہوگی۔ حریّت پسندوں کو اس ملک کی زمین، اس کے عوام اور حکمران سب ہی کی دلی حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ حاصل نہ ہو تو کسی بھی تحریک کے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے آزادی کی تحریک چلانے والے اگر ضرورت پڑے تو خود اپنی تحریک کو تو التوا میں ڈال سکتے ہیں۔ مگر اپنی پناہ گاہ کی خرابی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم نے کشمیر کا بتیس ہزار مربع میل علاقہ جس بے سروسامانی میں آزاد کروایا وہ اگرچہ ایک منفرد تاریخی واقعہ ہے مگر کون نہیں جانتا کہ اس میں خدا کی کرم نوازی اور ہماری بہادری کے علاوہ سرزمین پاکستان کے عام و خاص کی حمایت، ہمدردی اور خود قربانیوں کا کتنا حصہ ہے۔ ان کے بغیر ہم ایک انچ بھی آزاد نہ کروا سکتے تھے۔

میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے فلسطینی بھائیوں نے اس حکمت کو نہ سمجھا اور ایسا عظیم نقصان اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہے، جس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ مگر وہ تو اس لئے بچے ہوئے ہیں کہ اس تحریک میں خود بڑی جان ہے کیونکہ وہ قبلہ اول کی بات ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہودیوں کے مزید خطرناک عزائم کی وجہ سے ہر عرب ملک کیا، ایک ایک فرد کو زندگی کا خطرہ ہے۔ اس لئے کئی باتوں سے چشم پوشی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کشمیری حضرات کوئی ایسی بات کریں جس سے تحریک کو تو سرے سے کوئی فائدہ نہ ہو مگر پاکستان کا نقصان ہوتا رہے تو یہ بات کوئی بھی محب وطن پاکستانی طبعاً اور فطرتاً برداشت نہیں کر سکتا۔ کرنا بھی نہیں چاہئے۔ خاص کر جب پاکستان کے اندر خود تحریک آزادی کشمیر جیسی کوئی چیز نہ ہو اور مرکزی حکومتیں مسلسل پسپائی اختیار کئے ہوئے ہوں تو کسی کشمیری کا محض ایڈونچر (طالع آزمائی) کرنا خود کشمیریوں کے لئے تباہ کن ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا جو بار بلا جواز کشمیریوں پر ڈالا گیا ہے۔ خدا جانے اسی کا کب تک اثر رہے گا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میرے نزدیک خورشید صاحب کی

Marfat.com

آزاد کشمیر کو تسلیم کروانے والی بات اور محاذ رائے شماری والوں کی خود مختاری' کی بات بے محل اور نقصان دہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں ایک اور بات کا ضمناً ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا بلکہ کئی اعتبار سے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ دشمن کی طرف سے تحریک آزادی کشمیر کو کمزور کرنے یا بالکل فنا کرنے کے جس قدر حربے ممکن ہیں ان میں سب سے مؤثر یہ ہے کہ پاکستان کی حکومتوں اور خود اہل پاکستان کی رائے کشمیریوں کے خلاف کر دی جائے اور یہ بات نہ صرف ناممکن نہیں ہے بلکہ اس کا آسان راستہ یہی ہے کہ کشمیر کے لوگ آزادی اور حریّت پسندی کے دعووں کے پردے میں پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچاتے رہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اہل پاکستان کا ہمارے ساتھ مودّت و مروّت کا رشتہ کسی صورت قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ وہ اصول ہے جس سے کسی بھی محب وطن کشمیری کو کسی صورت صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے' نہ اس کی اہمیت کو کم سمجھنا چاہیے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ پورے تالاب کو گندہ کرنے کے لئے محض ایک بدبودار مچھلی ہی کافی ہوتی ہے۔

آزادئ رائے کے تقاضے

رائے کی آزادی' جیسا کہ میں نے کہا ایک سرکش گھوڑا ہے اور ایک دودھاری تلوار بھی ہے۔ اگر اس سرکش گھوڑے کے منہ میں کوئی طاقتور لگام نہ ہو' جو صرف یقین و ایمان کی ہو سکتی ہے اور ایمان کے لئے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چھاپ بھی ضروری ہے' تو رائے کی آزادی اور آوارہ خیالی یا پریشان خیالی میں بہت باریک فرق رہ جائے گا وہ بھی اگر رہ جائے تو۔ ہم نے تو رائے کی آزادی کے لئے اسلام اور ملّت اسلامیہ کے مفادات کا راستہ متعین کیا ہوا ہے اور کوشش یہ بھی کی ہے کہ اس کے تند و تیز گھوڑے کو خدائے پاک کے ذکر اور دین رسول اللہ پر چلنے کی زبردست لگام دی جائے تاکہ یہ اسپ تازی ایسا بے راہ نہ ہو جائے کہ گھوڑا رہے نہ سوار۔ ابھی تک تو خدا کا کرم ہے کہ معاملات ٹھیک راستے پر ہیں۔

اگر رائے کی آزادی کو مجرّد کر کے دیکھا جائے تو ہماری سیاست میں 'الحاق پاکستان کی جو تحریک ہے وہ گذشتہ اور موجودہ دور کے سیاق و سباق میں کوئی زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ خاص کر ان حالات کے باعث جو پہلی جنوری ۱۹۴۹ء یعنی اس بدنصیب دن اور اس کے بعد واقع ہوئے' جس دن بین الاقوامی معاہدہ کے تحت مجاہدین آزادی سے کسی مشورے کے بغیر اور محاذ جنگ کی کیفیت سے قطعی ناواقفیت کی بنا پر محض بھارت کی اس شاطرانہ درخواست کی وجہ سے جو محاذ جنگ پر شکست فاش سے بچنے کے لئے کی گئی تھی' کشمیر میں جنگ بند کرادی گئی تھی' وہ حالات جن سے ہم گذر آئے ہیں اور ابھی نہ معلوم کب تک گزرنا ہو گا' وہ ہر قسم کی تحریک کے منافی ہیں اور جو کچھ ہے وہ بھی لے دے کر امان مانگنے کے برابر ہے۔ بلکہ ایک قدم کیا سینکڑوں قدم اس سے آگے۔ اگر انحصار ان حالات پر ہوتا تو یہ تحریک 'الحاق کی ہو یا آزادی کی' وہ سب اپنی موت آپ مرگئی ہوتیں۔ بلکہ اس کا عین مخالف ردِّ عمل بھی ظاہر ہو چکا ہوتا۔

Marfat.com

آزادی اور الحاق

آزادی اور الحاق بظاہر ایک غیر مناسب ترکیب دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ آزادی اور خود مختاری یا "تسلیم کیا جانا" باہم مترادف معنی میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ موجودہ دور کا سیاسی فیشن بھی یہی ہے، آزادی، خود مختاری، استقلال، حرّیت، علیحدگی وغیرہ وغیرہ۔ جس میں الحاق تو بہر حال کسی صورت نہیں آتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہماری یہ موجودہ قوم جس کے بچے بچیاں فیشن پرستی میں دنیا بھر سے آگے ہیں بلکہ جب انہیں سابقہ دور (بھٹو کے دور میں) میں تھوڑی سی ڈھیل ملی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم نے سابقہ زندگی کفر میں گزار دی ہے، نعوذ باللہ۔ ہمارے کتنے عزیز بچے بچیاں ہیں جن کو خالق نے تو خوبصورت بنانے میں کوئی بخل نہیں کیا مگر انہوں نے اس فیشن پرستی کے عشق میں اپنی شکلیں بھوت پریت کی سی بنالی ہیں۔ ناخن تراشنا جرم، بال جتنے لمبے ہو سکیں درست، غسل قطعاً نہ کیا جائے تاکہ جانوروں کی طرح جسم سے دور سے ہی بدبو آئے اور معلوم ہو جائے کہ ایک صاحب فیشن کی آمد ہے۔ کپڑوں اور لباس میں نفاست کی بجائے غلاظت اور عریانی ہو، نماز، روزہ اور خدا اور رسولؐ کا مذاق اڑایا جائے۔ ہر قسم کی منشیات عین آب حیات ہو جائیں۔ جنس کی کوئی نہ ظاہری تمیز، نہ باطنی فرق۔ کفر سے پاک کرنے والی نماز اور گناہوں سے پاک کرنے والا وضو، جیسے سہل اعمال مفروضہ اس لئے بھی ترک کئے جائیں کہ وہ فیشن میں حائل ہیں۔ یہ داستان کہاں تک بیان کی جائے۔ بہر حال ایک طرف یہ حال ہو اور دوسری طرف مرکزی حکومتوں کا انتہائی معاندانہ طرز عمل، تو اس کے باوجود اگر الحاق پاکستان کی تحریک باقی ہی نہیں بلکہ زندہ جاوید اور طاقتور ہے تو اس کی معلوم نہیں کیا صحیح توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مرکزی حکومتوں نے جتنی حوصلہ افزائی الحاق پاکستان کے مخالفین کی کی اور جتنی حوصلہ شکنی ان الحاق والوں کی کی، اگر اس کا حساب کریں تو یہ مسلم کانفرنسی کارکن انسان نہیں بلکہ کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوں گے۔ اسی لئے میں نے جل کر حفیظ پیرزادہ اور بھٹو کو ایک میٹنگ میں کہا تھا "یہ مسلم کانفرنسی جن کو آپ شکست دینا چاہتے ہیں، اگر آپ ان کے پاؤں دھو کر پیئں تب بھی ان کے احسان کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا"۔ مگر اس کے باوجود جوان کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور وہ بدستور اپنے ایمان پر قائم و دائم ہیں، یہ غالباً اس لئے ہے کہ پروردگار عالم ان سے ابھی کام لینا چاہتے ہیں۔ ارباب اقتدار نے تو تحریک پاکستان ختم کر دی ہے مگر مشیت ایزدی اس کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی لئے ان بے لوث اور مخلص افراد کو کسی کے احسان کا زیر بار نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ یہ مراعات اور عنایات اصل میں خود جزا بن جاتی ہیں اور بات ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مرگ آرزو ہو جاتی ہے۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

بات یہ کر رہا تھا کہ آزادی میرے نزدیک خود ایک ڈسپلن کا تقاضا بھی کرتی ہے اور ایک پختگی کی

Marfat.com

محتاج بھی ہے۔ ورنہ ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم والی بات کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار

انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

چنانچہ آزادی رائے اور خود آزادی کا مفہوم ہمارے ہاں اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عظمت کے ہم معنی ہے۔ جس کی عملی شکل پاکستان میں مرتب ہو سکتی ہے۔ اس لئے "الحاق" آزادی کا مترادف ہے۔ کیونکہ اس ملک کی تکمیل' سلامتی' استحکام اور بقا کا ذریعہ یہی ہے۔ بہرحال الحاق پاکستان اور اس کے علاوہ یا اس کے مخالف تحریکوں کا جائزہ لینے کا یہ محل نہیں ہے اس بارے میں تو ایک علیحدہ اور مکمل مقالے کی ضرورت ہے زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ اس پر بھی قلم اٹھاؤں گا۔

خبروں کی تحقیق

اس بات کا بھی کافی تجربہ و مشاہدہ ہوا ہے کہ خبریں کیسے غلط اور صحیح ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے ہاں کتنا فساد پھیلتا ہے اور یہ کہ غلط خبریں دینے والے کتنے "کاریگر" لوگ ہیں کہ بڑے سے بڑے عقلمند اور ذہین و فطین لوگوں کو بھی شیشے میں اتار لیتے ہیں ۔ میں نے بھٹو صاحب سے ۱۹۷۳ء میں کہا تھا "آپ کے گرد میرے مخالفین کا گھیرا ہے۔ مجھے بہت کم موقع ملتا ہے کہ میں بات کروں اس لئے مہربانی کر کے جب کوئی بات شک والی ہو تو مجھ سے پوچھ لیں تو یہ اچھا ہو گا" غصہ سے کہنے لگے "آپ مجھے ایوب خان سمجھتے ہیں کہ کان میں اگر کوئی کھس کھس کرے گا تو میں سن لوں گا" مگر ہوا بالکل وہی جو میں محسوس کرتا تھا کہ ایسا ہو گا۔ چنانچہ ان ہی کھس کھس کرنے والوں نے' خدا ان کا بھلا کرے' بھٹو صاحب سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ سردار قیوم کے ساتھ ملاقات نہیں کرنا ہے۔ مگر وہ ایسی آگ سے کھیلے کہ سردار قیوم تو الحمدللہ جیسا بھی ہے' ہے 'مگر وہ نسیاً منسیاً ہو گئے۔ تو میں حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ جس حد تک ہو سکے خبر کی کچھ تحقیق بھی کر لی جائے۔ اس لئے بھی میں ذہنی طور پر فساد سے بچا رہتا ہوں۔ کئی بری خبریں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا نوٹس نہ لیں تو وہ وقت کے گہرے قبرستان میں خود بخود دفن ہو جاتی ہیں اور اگر ان پر ردِّعمل ظاہر کیا جائے تو وہ تاریخی حادثات بن جاتی ہیں۔ حسن انتخاب اپنے ہاتھ میں ہے۔

مرکزی حکومت کے ساتھ تعلقات

آزاد کشمیر میں' جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو جاتا' اس وقت تک میرے نزدیک مرکزی حکومت اور آزاد کشمیر کے تمام لوگوں میں بلا امتیاز جماعت اور خاص کر مسلم کانفرنس کے ساتھ کوئی

Marfat.com

بنیادی مخالفت نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح آزاد کشمیر کی حکومت کی بھی مرکز کے ساتھ معمولی سی مخالفت بھی زہر قاتل ہے۔ سیاست میں میری یہ سوچ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ ۱۹۵۶ء میں سہروردی مرحوم کے ساتھ اسی پر اختلاف ہوا تھا جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں۔ پھر دوسری مرتبہ ۱۹۶۶ء میں فیلڈ مارشل مرحوم نے اپنے دو اور رفیقوں کی موجودگی میں مجھ سے کہا "آزاد کشمیر میں مسلم لیگ کیوں نہیں بنالیتے؟"۔ بات دلچسپ ہے اس لئے پوری بیان کر دوں۔ میں نے کہا "اس میں ایک نقص ہے" ایسا جواب تو وہ کسی سے سننے کے عادی نہیں تھے اور اپنی عقل و فکر پر حرف سمجھتے تھے۔ جھنجلا کر کہنے لگے "کیوں؟ کیا اس لئے کہ اور پارٹیاں بھی بن جائیں گی؟"۔ میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی کچھ بات ہے" متعجب ہو گئے کچھ ڈھیلے ہو گئے اور کہنے لگے "بتاؤ وہ کیا بات ہے"۔ میں نے کہا "جناب! کشمیر پر ایک دعویٰ آپ کا ہے اور ایک بھارت کا۔ بھارت بڑا ملک ہے اور کشمیر پر قابض بھی ہے۔ اس کو آسانی سے وہاں سے نکالا بھی نہیں جا سکتا۔ آپ کا زرعی، معاشی اور دفاعی مفاد ہے۔ مگر یہی مفاد بھارت کا بھی ہے اس کی باقی باتیں اس پر مستزاد ہیں۔ اس لئے اگر کوئی بھی عدالت انصاف کرے تو بھارت کے حق میں فیصلہ کرے گی۔ لیکن کشمیر پر آپ کا ایک دعویٰ ایسا ہے کہ اس کے باعث آپ کا پلڑا بھاری ہے اور اس کا بھارت کے پاس کوئی جواب نہیں ہے"۔ کہنے لگے "وہ کیا ہے" میں نے کہا "وہ یہ ہے کہ کشمیری خود چاہتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوں۔ اس لئے جب پاکستانی سیاسی جماعت وہاں قائم ہو گئی تو پھر اس کی آواز کشمیریوں کی آواز نہیں رہے گی بلکہ وہ بھی آپ ہی کی آواز ہو گی۔ اور دوسری مشکلات کے علاوہ اس میں خود ہمارے ہاں بھی وہ وزن نہیں رہے گا" انہوں نے اس حقیقت کا واضح اعتراف کیا اور کہا "ٹھیک ہے مسلم کانفرنس ہی رہنا چاہئے"۔ اس وجہ سے نہ صرف ان کا سابقہ غصہ فرو ہو گیا بلکہ ہمارے درمیان بہت دلی اور قریبی تعلق محسوس ہونے لگا۔

راولپنڈی میں انٹر کانٹی نینٹل والی میٹنگ آپ کو یاد ہو گی جس میں ہماری مجلس عاملہ سے وزیر اعظم بھٹو نے بھی خطاب فرمایا تھا میری تقریر کے وہ خاص حصے بھی آپ کو یاد ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ بھٹو مرحوم کے نام سے خواب میں بھی لرزتے تھے تو اگر یہ کہا جائے کہ ہم لوگ بکاؤ مال تھے، تو ان واقعات کی کیا توجیہ کریں گے۔ ان حضرات کو کیا معلوم ہے کہ:۔

ع کرگس کا جہان اور ہے شاہین کا جہان اور'

اس میٹنگ سے ہمارے بعض قومی رہنما مجھ سے بہت خفا تھے اور غالباً اب بھی ان کی وہی رائے ہو گی۔ کیونکہ وہ ہمارے اس مذکورہ بالا سیاسی فکر کے بارے میں زیادہ واقف نہیں ہیں کہ ہم لوگ مرکز کے ساتھ تعلقات اور پاکستان کی سیاست کو سردست علیحدہ رکھنے میں کس درجہ حسّاس ہیں اور خود قومی مفاد میں اس کی اپنی اہمیت کیا ہے؟ بھٹو صاحب کے ساتھ بھی آزاد کشمیر میں پی پی کے قیام پر ہی اختلافات کی بنیاد پڑی تھی۔ مگر وزیر اعظم کی حیثیت سے ہم نے ان کی عزت کی اور ان کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے

Marfat.com

میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہی غلطی جماعت اسلامی نے بھی کی۔ یہاں بھی اپنی ایک سیاسی شاخ قائم کر دی۔ اپنے ملک کے ساتھ سیاسی انصاف اور سیاسی بصیرت کا اوّلین تقاضا تو یہ تھا کہ پوری ملت پاکستانیہ ریاست میں صرف اس عنصر کے پشت پر ایک فرد واحد کی طرح کھڑی ہوتی جو عنصر الحاق پاکستان کی تحریک چلا رہا ہے اور جس کے نتیجہ میں یہ آزاد کشمیر کا ٹکڑا ہمیں ملا ہے۔ مگر بد قسمتی سے ایسی بصیرت اور ایمان کوئی در آمد کرنے والی شے نہ بن سکی۔ کسی نے اس کا نوٹس ہی نہ لیا اور جو لیا تو وہ نتیجہ کے اعتبار سے اپنی ہی قوّت کے انتشار کا باعث بنا۔

اسی حالت کا ایک نازک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم کشمیر کے مسئلہ میں کسی بھی مرکزی حکومت پر کلیتہً اعتماد اور بھروسہ نہیں کر سکتے اور وہ بھی کبھی ہمیں اعتماد میں نہیں لیتے۔ مجبوری شاید دونوں طرف ایک جیسی ہے۔ ان کو اگر کشمیر آزاد کروانا ہو اور وہ اس تحریک کو تکمیل پاکستان کا حصہ سمجھیں تو پھر خواہ ہم سے دوستی ہو یا دشمنی، ہم پر ہی اعتماد کرنا ہو گا۔ لیکن اگر مسئلہ کشمیر کو دفن کرنا ہو اور اس سے جان چھڑانا چاہتے ہوں تو پھر ہم ہی پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ پھر تو وہی کرنا ہو گا کہ ہماری آواز کو حتی الامکان غیر مؤثر کر دیا جائے جیسا کہ سب حکومتیں کوشش کرتی آئی ہیں۔ میں نے بھٹو صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا "یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ کشمیر کے بارے میں ایک بات پر تو آپ کا اور بھارت کا اتفاق رہا ہے" مراد ان کی ذات نہیں تھی، حکومت کی پالیسی تھی۔ پوچھنے لگے "وہ کیا ہے" میں نے کہا "بھارتی حکمران وہاں ریاست کی قیادت کو کمزور کرنے کے خواہشمند ہیں اور آپ یہاں۔ مگر وہاں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ یہاں نہیں معلوم اس کی کیا وجہ ہے"۔

پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے حکمرانوں کی باقی امور کی طرح اس معاملہ میں بھی پالیسی سرکاری ملازمین کی سطح پر ہی ترتیب دی جاتی ہے اور وہ ایک خاص قسم کی ایسی منظر کشی کر کے ان کو دکھاتے ہیں کہ یہ بیچارے ناکارہ لوگ ان کے ساتھ اتفاق کئے بغیر اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ کسی بھی حکمران کی ہمارے ہاں اپنی سوچ تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو کم از کم اس کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ دل میں ہو تو الگ بات ہے۔ مرکز کے ساتھ ہمارا تصادم اس لئے بھی ہوتا رہتا ہے کہ ہماری سوچ اپنی ہے اور زندگی بھر کی کاوشوں اور قربانیوں سے مرتب ہوئی ہے۔ اس پر ہم کیسے کوئی سودا کر سکتے ہیں یا جن کی سوچ ہم سے پیچھے ہے وہ ہمیں کیسے خرید سکتے ہیں یا ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

اسی کشمیر کے بارے میں یاد آیا کہ میرے کہنے پر بھٹو صاحب نے اپنی وزارت خارجہ والوں کے ساتھ میری ایک طویل میٹنگ کروائی تھی جس میں زیر بحث بات یہ تھی کہ ہماری وزارت خارجہ عرصۂ دراز سے ملک کے باہر اور اندر کشمیر کی خود مختاری کی تحریک کی حمایت کر رہی تھی اور ان کو پسند نہیں تھا کہ میں بحیثیت صدر اس تحریک کی اس شدومد سے مخالفت کروں جو میں کر رہا تھا۔ وزارت خارجہ کے لوگ اگرچہ مجھ سے ہر لحاظ سے بہتر پوزیشن میں تھے مگر اللہ کا شکر ہے کہ ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ وہ غلطی پر تھے۔ گویا

Marfat.com

اپنے ہی ملک کے مفادات کے خلاف کام کرتے رہتے تھے یہ بہت تفصیل طلب بات ہے۔ پھر کبھی موقع ملا تو بیان کروں گا انشاءاللہ۔ یہاں اس بات کے بیان کرنے کا مقصد صرف اس قدر بتانا ہے کہ گرمی ہو یا سردی، سختی ہو یا نرمی ہر حال میں خدا کی توفیق سے میں نے اصلاح احوال کی کوشش جاری رکھی اس امر کا لحاظ کئے بغیر کہ حکومت کو میری بات پسند ہے یا ناپسند۔

مختصر یہ کہ ہم مرکزی حکومت سے اگرچہ جنگ آزمائی کو نہایت ہی مضر جانتے ہیں، لیکن مسئلہ کشمیر کے بارے میں کسی بھی حکومت کو عقیدے، معلومات اور مستقبل کے بارے میں تجاویز کے سلسلے میں اپنے سے بہتر پوزیشن میں نہیں دیکھتے۔ خود حکومت کی خواہش تو ظاہر ہے یہی ہوتی ہے کہ ان کی بات کو ہی فوقیت دی جائے اور ان کو ہی عقل کل مانا جائے مگر مجھے افسوس ہے کہ کشمیر کے معاملہ میں ہم ایسا کر سکے ہیں نہ کر سکیں گے۔

استحکام اور حزب اقتدار و حزب اختلاف

میں سیاست میں اس بات کا بھی قائل نہیں ہوں کہ جب کسی ایک جماعت کی حکومت بن جائے تو وہ اس کو ایک گروہ یا جماعت کے پاس رہن رکھ دے بلکہ وہ اخلاص کے ساتھ تمام لوگوں کے لئے ہونی چاہئے حتیٰ کہ غیر مسلم شہریوں کے حقوق بھی اس پر اسی طرح ہوں گے۔ مگر ہمارے ہاں مسلسل اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی ہے۔ حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں دشمن اور متحارب گروہوں کی طرح کام کرتے ہیں جو میرے نزدیک تباہی کی علامت ہے۔ پھر برسر اقتدار آنے والی ہر حکومت اپنا فرض سمجھتی رہی ہے کہ پہلی حکومت کے کاموں کو درہم برہم کر دیا جائے۔ اگر یہی شب و روز رہے تو پھر ملک میں استحکام کیسے اور کب پیدا ہو گا۔ میں نے ایک وزیر اعظم سے کہا کہ پہلی حکومت نے ہم سے یہ کہا تھا کہ یہ کام ایسا ہو گا۔ تو وہ برہم ہو کر کہنے لگے "میں یہاں ہوں ہی صرف اس لئے کہ اس کے کئے ہوئے تمام کاموں کو کالعدم (Undo) کر دوں" ایسی فکر کے ساتھ بھی مجھے شدید اختلاف رہا ہے۔

ایم آر ڈی میں شمولیت اور علیحدگی

کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہوں تو اچھے سے اچھے لوگ بھی شک اور تردّد میں پڑ جاتے ہیں۔ عام حالات میں تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو گی خصوصاً سیاسیات میں تو ایسا ہونا ایک عادت ہے۔ پھر جبکہ ہمارے ہاں فضا پہلے ہی شکوک و شبہات کے زہر سے مسموم ہو تو ظاہر ہے کہ عدل و انصاف اور حسن ظن پر مبنی توجیہ کرنا ہر شخص کے بس کا کام ہے نہ آسان۔ ایسے ہی واقعات

Marfat.com

میں سے ایک واقعہ میرا ''ایم آر ڈی'' میں شامل ہونا اور نکلنا بھی ہے۔ میری شمولیت پر بھی بہت لوگوں کو اعتراض اور بے حد تردّد تھا۔ کئی ایک کو شک بھی ہو گا۔ جو کچھ ان شکوک و شبہات میں سے میں نے سنا' اس سے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ کیا کیفیت تھی۔ میرے وہاں سے نکل آنے سے ان لوگوں کو تو بہر حال اطمینان ہوا ہو گا بلکہ خوشی ہوئی ہو گی۔ اس قسم کے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم نہیں ہے مگر بد قسمتی سے ہیں وہ اس ملک میں ''بے بس اکثریت'' یہ صرف دل میں ہی کسی بات کو اچھا یا برا سمجھتے ہیں۔ اس سے آگے ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس ملک میں یہ بے چارے محض دعا گو حضرات کا طبقہ ہیں۔ (خدا ان کو خوش رکھے)۔

اسی طرح ایم آر ڈی سے میرے نکل آنے پر اس ملک کے بے شمار لوگوں کو حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی' اور ظاہر ہے کہ شکوک بھی ہوئے ہوں تو جائز ہے۔ اس کا بھی مجھے بڑی حد تک علم ہے' البتہ یہ لوگ جن کو اس وجہ سے صدمہ ہوا وہ لوگ ہیں جو اپنی رائے اظہار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور جن کا تعلق اس وقت ''بے بس اقلیت'' کے ساتھ ہے' اکثریت کے ساتھ نہیں۔ ایم آر ڈی سے نکلنے کے لئے میری جو بھی وجوہات ہوں مگر وہ واقعہ ایسا ہے کہ اس کی کوئی حسن ظن والی توجیہ یا تاویل کرنا آسان نہیں ہے۔ اخلاقی طور پر میں ان تمام حضرات کے سامنے جوابدہ ہوں جو اس میں شامل تھے۔ خاص کر بیگم صاحبہ کے سامنے۔ اس لئے کہ وہ ایک خاتون ہیں اور ماضی کے واقعات کی وجہ سے ان کو کئی قسم کے شبہات ہو سکتے ہیں۔

کئی کوتاہ اندیشوں نے تو برملا کہا کہ سردار قیوم نے پی پی سے انتقام لیا ہے۔ ادھر ایک واقف حال دوست نے سنایا' دروغ بر گردن راوی' کہ ضیاء الحق صاحب سے کسی نے کہا کہ ''سردار قیوم نے بڑی جرأت کی ہے اور ایسا ایسا کیا ہے''۔ تو بقول ان کے' ضیاء صاحب نے کہا ''اس نے ہمارے کہنے سے تھوڑا ہی کیا ہے۔ ہم پر کیا احسان ہے۔ وہ تو ملک کے مفاد میں اس نے ایم آر ڈی کو چھوڑا ہے''۔ ''زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا'' والی بات ہو گئی۔ میں نے جب شیر باز خان مزاری صاحب کا بیان پڑھا کہ ''سردار قیوم کو ایم آر ڈی میں بھیجا ہی حکومت نے تھا'' تو میں حیران ہو گیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ سردار ہیں اور سردار بھی ہمارے حکمرانوں کی ہی طرح اطلاعات رکھتے ہیں۔ ان کے بھی اپنے آنکھ کان کم ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم کافی دیر سہالہ اکٹھے رہے تھے اور پھر اس تحریک میں بھی ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے جائز توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ میرے بارے میں اور جو کچھ کہیں' مگر ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اگر ان کی مردم شناسی اور اطلاعات کا یہی حال ہے اور اسی پر وہ سیاست کرتے ہیں تو پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ تاہم بعد میں ان سے ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ بات ان کے ساتھ غلط منسوب کی گئی تھی۔

میں ایم آر ڈی کے بنانے اور اس سے نکلنے کے اسباب پر اس وقت اتنی طویل بات نہیں کر سکتا البتہ اتنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں حکومت کا ہاتھ تو درکنار' حکومت نے اگر میرے بارے میں

Marfat.com

سوچا بھی ہو تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا اور اگر زندگی رہی تو کوئی دوسرے ایسے ہی واقعات کی طرح اس کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس وقت میرے نکل آنے سے ایم آر ڈی کی سیاست کا بے پناہ نقصان ہوا جس کا اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ اس سے میری ذاتی حیثیت متاثر ہو گی جو ہوئی بھی۔

بہر حال اس کا پورا فائدہ موجودہ حکومت کو پہنچا جو اس کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ اس لئے جن کو میری بات پر یقین نہیں ہے ان کو تو پھر وقت ہی بتلائے گا کہ صحیح بات کیا ہے۔ حکومت کے کارندے تو کسی بارے میں کیا کیا کچھ نہیں کہتے؟ اس کو اگر شمار کریں تو کوئی بھی ایک شخص ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دوسروں کو ایسے ہی شبہات نہ ہوں۔ مگر ایسے واقعات کو خود واقعات کی ہی روشنی اور سیاق وسباق میں دیکھا جائے اور کسی تعصب یا محض خبر پر انحصار نہ کیا جائے تو صحیح بات تک پہنچنا مشکل نہیں ہو گا۔

دلی کا پانچواں سوار

صاحبزادہ فاروق علی کا بیان پڑھا تو میں سوچتا تھا یا اللہ یہ یہ دلی کا پانچواں سوار کون ہے؟۔ ایں چہ ابوالعجبی است؟ جس شخص کا کوئی دور کا بھی تعلق ان امور کے ساتھ نہیں تھا۔ اس دور کے سپیکر کی اور کسی دوسرے کی بھی کیا حیثیت تھی؟ ایسی بات البتہ اگر بیگم صاحب کہتیں تو اس کا کچھ مطلب ہو سکتا تھا۔ ان کی بات غلط بھی ہوتی' تب بھی بہت لوگ اس کو سچا سمجھتے۔ پھر یہ بات اگر جتوئی کرتے یا زیادہ بہتر یہ کہ ان امور کے انچارج حفیظ پیرزادہ نے یہی بات کہی ہوتی یا افضل سعید جان تھے' وقار احمد' میجر جنرل امتیاز' مسعود یہ لوگ تھے کہ اگر ان میں سے کوئی ایسی بات کرتا تو اس کا کچھ مطلب ہو سکتا تھا۔ پھر انہی فاروق علی صاحب کے بھائی رؤف علی صاحب ہمارے آئی جی پولیس رہ چکے ہیں۔ وہ ہم سب کے اندرون سے واقف ہیں۔ وہ اگر کچھ کہتے تو شک ہوتا کہ معلوم نہیں کیا بات ہے؟ مگر بات کی بھی تو کس نے اور اس کا منصب کیا تھا؟ اس کا جواب جو آپ نے دیا کافی سے زیادہ تھا۔ اور میں بھی دو لفظوں میں اس کا جواب دے سکتا تھا۔ وہی جو جھوٹوں کے بارے قرآن کریم میں آیا ہے۔ لیکن چلئے اسی بہانے سے میں نے اپنی سیاست اور سیاسی فکر کے کئی گوشوں کا ذکر کر دیا تاکہ میرے بارے میں کسی بھی بات کو پرکھنا ہو تو اس کے صحیح سیاق وسباق میں پرکھا جا سکے۔ نیز اس سے سیاسیات کے طالب علموں اور نوجوانوں کی بھی انشاء اللہ رہنمائی ہو گی۔ واقعات اور مثالیں اس لئے درج کیں کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ تو ناقابل عمل اور محض ایک خیالی فلسفہ ہے بلکہ یہ معلوم ہو کہ اس پر عمل نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہو رہا ہے۔ اور یہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو ان باتوں سے حوصلہ ملے گا اور عزائم کو تازگی ملے گی۔ ان میں سے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے درجنوں گواہ زندہ موجود نہ ہوں۔ یہ کوئی فرضی داستانیں نہیں ہیں۔

Marfat.com

حرفِ آخر

حرفِ آخر کے طور پر ذکر کروں کہ یہ ایک تاریخی سانحہ ہے کہ مملکت خداداد، جس کا وجود میں آنا ایک مصلحت خداوندی تھی، اپنے وجود میں آنے کے بعد سے اس کو قائم رکھنے اور مضبوط و مستحکم کرنے کے اسباب و ذرائع سے ہنوز محروم ہے۔ اس میں سرفہرست یہ کہ اس مملکت کو اس کی اصل حیثیت کے مطابق یعنی اس کی نظریاتی اساس، خصوصی جغرافیائی محل وقوع، اس کی سرزمین مع اپنے ذرائع و وسائل کے، اس کے عوام کی وافر صلاحیتیں اور اس کے متوقع بین الاقوامی کردار کی مناسبت سے جس قسم کی صاحب ایمان و صاحب بصیرت قیادت کی ضرورت تھی، ابھی تک تو اس کے کوئی خدوخال دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے بھٹو صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات میں ان سے کہا تھا۔ اگرچہ ایک اچھی حکومت بھی کسی ملک کی بڑی اہم اور بنیادی ضرورت ہے مگر اس ملک میں ہمیں ابھی حکومت سے زیادہ اچھی قیادت کی ضرورت ہے۔

جب ہم اپنے عوام ملک اور نظریئے وغیرہ کی نسبت سے حکمرانوں کے طرز عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو سابق غیر ملکی حکمرانوں سے کوئی زیادہ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ نا اہلیت، بے یقینی، بد ذوقی، عدم استحکام اور کم کوشی کی مثالیں اس پر مستزاد ہیں۔ چالیس سال ہونے کو ہیں مگر ابھی تک ہمارا کوئی دستور عملاً موجود نہیں ہے۔ قوانین کا احترام سرے سے اٹھ گیا ہے۔ ہو بھی کیسے؟ جبکہ کوئی ایک قانون ہی نہیں ہے اور قانون سازی کا مقصد بھی ذاتی مفادات رہ گیا ہے۔

قانون ساز خود کسی قانون کے پابند نہیں ہیں۔ اس وقت تو بیک وقت چند مختلف اور باہم متضاد و متناقض قوانین نافذ ہیں۔ مارشل لاء، سول لاء، شریعت اور ڈنڈا بد اخلاقی اور بے راہ روی کی رفتار تو جیٹ طیارے سے بھی تیز ہے۔ قومی یکجہتی اور ہم آہنگی تو محض کتابی محاورے رہ گئے ہیں۔ انتظامی صلاحیتوں میں ترقی کے بجائے انحطاط ہو رہا ہے۔ میں نے جنرل رحیم خان کو لکھا تھا "اگر آپ پی آئی اے کو ترقی دینے کے بجائے اس کو بیس سال پیچھے لے جاسکیں تو یہ بڑی قومی خدمت ہوگی" باہمی تعاون اور ہمکاری کی فضا سرے سے مفقود ہے۔ کوئی دوسرے کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ادنیٰ سے اختلافات بھی دشمنی سمجھے جاتے ہیں۔ اصولی اختلاف رائے ہو کہ غیر اصولی، صحت مند ہو کہ غیر صحت مند سب ایک ہی کھاتے میں ہیں۔ حکومت اتحاد و یکجہتی کے نام سے ڈرتی ہے۔ حکومت یہ ہو یا کوئی اور حکومت، عوام اسی طرح محکوم ہیں۔ مظلوم مظلوم تر ہے۔ غریب غریب تر "حکمران خود کو ہی عقل کل سمجھتے ہیں اور اپنی یہ حیثیت دوسروں سے بھی منوانا چاہتے ہیں۔ جس میں ادنیٰ سی بھی صلاحیت ہے وہ اپنی پارٹی علیحدہ بنائے بیٹھا ہے۔ ملک پر قرضوں اور امدادوں کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے اور ترقیاتی منصوبہ بندی

Marfat.com

ایسی ہے جو خود ہی اپنے آپ کو کھا جاتی ہے۔ جس کو انگریزی میں (Counter Productive) کہتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ قیادت کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔ یہ ادارہ خواہ کیسا بھی ہو۔ جبکہ اس کے بغیر کسی ملک کا قائم رہنا یا مستحکم ہونا ناممکن ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے تمام خاندان کو قتل کرنے کا جو جرم کیا' وہ اپنی جگہ' مگر تاریخی جرم یہ تھا کہ اس نے قیادت کا ادارہ ہی ختم کر دیا اور بس وہ حکومت بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ کسی لیڈر کی موت بھی اکثر اوقات پوری قوم کی موت سمجھی جاتی ہے۔ مگر ادارہ باقی ہو تو زندگی کی امید باقی رہتی ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ وسلم کے وصال مبارک پر ایک ادارہ موجود تھا' جس نے بلا تاخیر حکومت کے خلا کو پُر کر دیا۔ اس لئے کسی قوم یا ملک کی اصل موت قیادت کے ادارے کا قتل ہے۔ چنانچہ میں نے ضیاء الحق صاحب سے بھی کہا تھا کہ غلط ہی سہی مگر فوج کو ہی قیادت کا ادارہ مقرر کر دیں تاکہ یہ خلا تو پُر ہو جائے۔ اس کے لئے لیڈروں کو بھی آنریری جرنیل بنا دیں۔

جو دوسرے ادارے ہیں ان کا بھی کوئی تقدس نہیں رہنے دیا گیا۔ اپنے ماضی کی تاریخ' تہذیب و ثقافت غرضیکہ ہر شے کے ساتھ رشتے اگر ٹوٹ نہ رہے ہوں تو ڈھیلے ضرور ہو رہے ہیں۔ اور وہی گہری وابستگی ہے جو کسی بھی قوم کو ایک امتیاز اور تشخص عطا کرتی ہے۔ غرضیکہ ہمارے اس خداداد ملک کا ڈھانچہ صرف اس لئے کھڑا ہے کہ دست قدرت کسی کو اسے گرانے کی اجازت نہیں دے رہا۔ معلوم نہیں علامہ مرحوم کی اس زرخیز مٹی میں نم کب پڑے گی۔

ہماری قیادت و سیادت عرصہ دراز سے خدائے پاک کے اس ارشاد "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" کا مظہر بنی ہوئی ہے۔ در حقیقت ہمارا عمل کسی بھی ایک راستے پر ہے نہیں۔ ہمارے ہاں عدم استحکام کی یہ بھی ایک بنیادی وجہ ہے۔ نہ ہم خالص لادینی سیاست پر چل رہے ہیں' نہ دینی پر۔ جب ایسی صورت ہو کہ ایمان بھی ادھورا ہو اور ہم نافرمانی کے بھی مرتکب ہو رہے ہوں' تو خدا کی نصرت کہاں سے آئے گی؟ وسائل و ذرائع اور ساز و سامان کی کمی ہو' عقل و تدبر سے بھی کام نہ لیں' رہی سہی طاقت کو خود گھر میں ہی ایک دوسرے کے خلاف استعمال کریں' خدا کی امداد بھی نہ ہو تو پھر اس دنیا میں عزت سے رہنے کا ہمارا استحقاق کیا ہے؟ ایسے میں تو پھر ہمارا مقدر یہی دریوزہ گری اور دوسروں کی محتاجی ہو سکتی ہے۔

اس وقت تو حالت کچھ ایسی ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کون کیا ہے؟ مرد ہے یا عورت' ملازم ہے یا بد معاش' تاجر ہے یا چور' سیاستدان ہے یا مجرم' مسلمان ہے یا منافق' وفادار ہے یا غدار۔ عجیب حالت ہے اس کو کوئی ادیب اور شاعر ہی صحیح بیان کرے تو کرے۔ قلندر صاحب کے اس مجذوب کی بات یاد آ رہی ہے جس نے خود فراموشی کی وجہ سے اپنی پہچان کے لئے اپنے گلے میں سرخ رومال باندھا ہوا تھا۔ اس کو سویا ہوا دیکھ کر کسی نے ازراہ شرارت وہ رومال کھولا اور اپنے گلے میں ڈال لیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو

Marfat.com

اس کو دیکھ کر پوچھتا ہے۔ "تو میں ہے کہ میں تو ہوں" اگر ہمارے حالات کا شب و روز یہی رہا تو ہماری حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہو گی۔

ہم جن ان گنت مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں وہ طبعی تھوڑی ہیں' زیادہ تر ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ان سے نکلنے کی راہ نہ امریکہ ہے نہ روس' نہ چین نہ بھارت' نہ کوئی اور۔ ان مادی قوتوں سے اگرچہ کوئی مفر نہیں ہے تاہم ان کے حضور عاجزی کرنا اور پابوسی بجالانا اس لئے مفید نہیں ہے کہ ان کو ہماری حیثیت معلوم ہو چکی ہے۔ ایسی حالت میں غیروں کے ساتھ مفاہمت کا مطلب اپنی جان و مال اور وجود کی قیمت ادا کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ اگر ہم پوری طرح اسلام کی رسی کو پکڑنے کے اس وقت اہل نہیں ہیں تب بھی ہمیں دنیاوی امور میں تو کم از کم وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے جو عقل و دانش کے نزدیک صحیح ہو۔ ورنہ ہمارے خلاف کوئی دوسرا کچھ بھی نہ کرے تب بھی خود ہمارا اپنا متضاد عمل ہی ہماری بربادی کے لئے کافی ہے۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے کہ پاکستان کے دشمن اور اس کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے والے سردست آرام کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کا مقصد بغیر کسی تکلیف کے خدانخواستہ پورا ہو رہا ہو' تو وہ کیوں مفت میں بدنامی اور تباہی کا راستہ اختیار کریں۔

اسلام پر چلنے سے میری مراد وہ نہیں ہے جس کا ہم آج کل رونا رو رہے ہیں۔ وہ علیحدہ موضوع ہے' جس کا ذکر پھر کسی فرصت میں کروں گا انشاءاللہ۔ البتہ اتنا کہتا ہوں کہ اسلام پر چلنے کے طریقۂ کار میں تو کئی رائیں ہو سکتی ہیں۔ مگر ایک بات بالکل قطعی اور بنیادی ہے۔ وہ یہ کہ آیا ہم خود اسلام پر چلنا چاہتے ہیں یا خود اسلام کو ہی اپنے راستے پر چلا کر خود اسلامی کہلانا چاہتے ہیں؟ مقصد آیا اسلام ہے اور ہم ذریعہ ہیں یا مقصد ہم ہیں اور اسلام محض آلۂ کار ہے؟ جب تک کوئی شخص خاص کر سیاسیات میں اس فکر کو خالص نہیں کرے گا اور اپنے فکر و سوچ کے گھوڑے کو ایمان و یقین کا کامل سوار بن کر ذکر خداوندی کی سخت لگام نہیں دے گا وہ منزل کو نہیں پہنچے گا۔ اس کا راستہ پھر کعبہ نہیں' ترکستان کا ہو گا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ ای اعرابی - کیں رہ کہ می روی بترکستان است

ہمارے ہاں مفاد پرستی اور جاہ طلبی نے ایک وبائی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس سے ایسا پیشہ وارانہ ذہن تیار ہو گیا ہے کہ اس نے سیاست ہو یا دین یا کوئی اور شعبہ زندگی' سب کو متاثر کر دیا ہے۔ دین کو تو چونکہ خدا نے محفوظ رکھنا ہی ہے' اس لئے وہاں تو ضرورت کے مطابق وہ اپنے خاص بندوں کو مناسب توفیق عطا کرتا رہے گا۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس سلسلہ میں بھی شکایت ہے کہ "تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند"۔ مگر سیاست میں تو برا حال ہے۔ کسی ایک مسلمان ملک کی بھی ہم مثال نہیں دے سکتے جہاں اسلام تو بڑی بات ہے' محض بنیادی انسانی اقدار کے مطابق ہی زندگی چل رہی ہو۔ مغربیت ہر جگہ' ہر گھر اور ہر فرد پر سوار ہے اور کسی نہ کسی روزن کے ذریعہ بڑے مضبوط قلعوں میں داخل ہو گئی ہے۔ خدا کرے کہ ہمیں اس کا احساس ہو' ہم کہیں تو رکیں اور یہ موڑ مڑیں۔

Marfat.com

اس سے خدانخواستہ ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ سارا زمانہ خیر سے خالی ہو گیا ہے اور کسی سطح پر کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ الحمدللہ دبی ہوئی آتش کی چنگاریاں ہر جگہ موجود ہیں۔ کچھ شعلہ بنیں مگر مخالف ہواؤں کی سختی کی نذر ہو گئیں۔ یہ کشمکش خود ہی ایک زبردست تاریخی عمل ہے اور اپنے وقت پر ضرور پھل لائے گی ان شاءاللہ العزیز۔

ہماری اصل ضرورت صحیح قیادت

ہماری اصل ضرورت، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، صحیح قیادت ہے۔ صرف ہماری ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ضرورت یہی ہے۔ جو قومیں دوسروں کو شخصیت پرستی پر ملامت کرتی ہیں، وہ خود شخصیات کی محتاج اور ان کی پجاری بننے پر مجبور ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری پوری توجہ جاہ پرستی کی طرف ہو گئی ہے، اس لئے ہماری سیاست بھی محض اقتدار پرستی یا اقتدار پسندی کے رجحان کا شکار ہو گئی۔ اس لئے ہمیں صرف حکومتیں ہی میسر آتی رہیں قیادت نہ ملی۔ برسراقتدار آنے والے لوگوں میں سے بھٹو صاحب میں وہ صلاحیت بہت نمایاں تھی مگر ایک تو وہ اپنے اضداد کی تاب نہ لا سکے، دوسرے وہ بھی اس زہر کا شکار ہو گئے جس سے بے شمار حکومتیں، حکمران اور قومیں برباد ہو گئیں۔ وہ زہر اقتدار کو طول دینے کی بے مہابا خواہش اور آرزو ہے۔ یہی آرزو انسان کو وہ تاریخی جرم کروانے پر آمادہ کرتی ہے کہ قیادت کے ادارے کو ہی قتل کر دیا جائے تاکہ حکومت کا کوئی دوسرا دعویدار پیدا نہ ہو سکے۔

مجھے بھٹو صاحب کی رفاقت میں خصوصاً اس دورے کے دوران جو انہوں نے آزاد کشمیر میں کیا تھا، جب اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے کئی اعمال و افعال اسی پوشیدہ خوف کی عکاسی کرتے ہیں تو میں نے اپنی بساط کے مطابق اس کو دور کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کے کاموں میں توازن اور ٹھہراؤ پیدا ہو جائے۔ میں نے ایک بار ان سے کہا آپ ایک لحاظ سے بہت خوش نصیب ہیں۔ "کیسے" انہوں نے پوچھا میں نے کہا "اس لئے کہ ابھی آپ کو اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ کوئی دوسرا آپ کی جگہ لینے کو تیار بیٹھا ہے۔ آپ اطمینان کے ساتھ ایک عرصہ تک کام کر سکتے ہیں"۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ پھر میں نے کہا "مگر اس قوم کی خوش نصیبی اس میں ہوتی کہ آپ کے علاوہ ایک نہیں متعدد لوگ اس قابل ہوتے کہ آپ کی جگہ لے سکتے"۔

اقتدار کو طول دینے کی خواہش

جب اپنے اقتدار کو طول دینے کی خواہش غالب آ جائے اور یہ بات ایسی نہیں ہے جو کسی ایک شخص کا جرم ہو، یہ اقتدار کا حصہ ہے اور جس کا بھی دل و دماغ اقتدار سے ذرہ برابر بھی متاثر ہو گا وہ اس خواہش کو

Marfat.com

سردار عبدالقیوم خان اور جنرل محمد ضیاء الحق

Marfat.com

کسی صورت نہیں روک سکتا۔ تو پھر حکومت اسلام کی ہو یا غیر اسلام کی، دونوں برابر ہو جاتی ہیں۔ خلفائے راشدین کی حکمرانی اس لئے بھی دنیا بھر میں ممتاز رہے گی کہ وہ واحد طبقہ تھا جس میں اقتدار کو دوام بخشنے کے بالواسطہ یا اشارے و کنایئے میں بھی کوئی آثار نہیں ملتے اور یہ بھی کہ انہوں نے اقتدار کے ادارے کو نہ صرف یہ کہ قتل نہ کیا بلکہ اس کے تقدس کو قائم رکھا اور اسی تقدس اور اس کی اہمیت کے اثر کا نتیجہ تھا کہ دم مرگ بھی اس بارے میں وہ حضرات گرامی رضوان اللہ علیہم اجمعین پوری طرح باہوش تھے اور اپنے بعد آنے والوں کے بارے میں صحیح فیصلے بھی کرتے رہے۔

جب میں قیادت کی بات کرتا ہوں تو اس سے صرف سیاسی قیادت ہی مراد نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے کی ایک اپنی قیادت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کوئی بھی شعبہ ہو، اخلاقی ہو، معاشی ہو، معاشرتی ہو، دفاعی ہو یا سیاسی، سب ہی اس قیادت سے محروم ہیں۔ ہماری کسی بھی حکومت کا یہ تاریخی کارنامہ ہوتا اگر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ ادارے قائم کر دیتے جو قیادت مہیا کرتے رہتے۔ ہم ہر زمانے میں کسی عبقری شخصیت کا کب تک انتظار کریں گے۔ قائداعظمؒ روز روز کب پیدا ہوتے ہیں میں سیاسی قیادت پر اس لئے زور دیتا ہوں کہ وہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ بھی ہو مگر معاشرے میں دوسرے گوشے قیادت سے خالی ہوں تو اس کی مثال ایک ایسے عظیم اور تناور درخت کی ہوگی جس کا نہ کوئی سایہ ہو نہ پھل۔

میدانِ سیاست

میں جب سیاست میں اقتدار پسند قسم کی قیادت کی خرابی کی بات کرتا ہوں تو اس سے وہ فکر مراد نہیں ہے جو آج کل عام ہے کہ "صاحب، یہ لوگ تو سب اقتدار چاہتے ہیں، اس لئے ان کو برا سمجھنا چاہئے" اقتدار اگر کوئی ایسی بری چیز ہے تو پھر یہ کہنے والے کیوں وہاں بیٹھے ہیں اور خود کو اچھا بھی سمجھتے ہیں اور اگر اچھی چیز ہے تو دوسروں کو اس کی خواہش کرنے پر کیوں ملامت کیا جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جب سیاستدان کے دماغ پر محض حکومت سوار ہو جائے تو پھر وہ معاشرے کے دوسرے امور پر توجہ نہیں دے سکتا اور یہ کہ پھر وہ حکومت حاصل کرنے کے ذرائع میں بھی جائز و ناجائز کی تمیز نہیں کرے گا۔ سیاستدان کے لئے دونوں میدان یکساں اس کی صلاحیت کا امتحان ہوتے ہیں۔ وہ حکومت میں ہو تب بھی اور حکومت سے باہر ہو تب بھی۔ اگر کار سیاست کو خود اسی کی غرض سے ہی چلایا جائے تب بھی حکومت خود بخود اپنے وقت پر ضرور آ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ سیاستدان حکومت پر سوار ہو گا نہ کہ حکومت اس پر سوار ہو گی۔

ذخیرہ

Marfat.com

غلامی کے اثرات اور علاج

اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی غلامی کے سوا باقی تمام قسم کی غلامی اپنی ہر حیثیت میں ایک لعنت ہے۔ خواہ وہ کسی پختہ کارے' کی کیوں نہ ہو' لیکن جس طرح یہ لعنت انسانوں کو نہ صرف آزادی کی بے بہا نعمت سے محروم کر دیتی ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کو خود اعتمادی کے عنصر سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ غلاموں کا علم و فضل اور زہد و تقویٰ بھی اس عنصر سے خالی ہو جاتا ہے۔ ایک معیاری اور صحیح قیادت کا کام بالکل اس کے برعکس ہے۔ صحیح قیادت ہی انسانوں کے اجتماع کو آزادی کی قدر و منزلت سکھاتی ہے۔ اعتماد پیدا کرتی ہے اور پھر اس خود اعتمادی میں مطلوبہ نظم و ضبط (ڈسپلن) بھی وہی پیدا کرتی ہے۔ ایک اچھی حکومت بھی کسی نہ کسی درجے میں وہی کام کرتی ہے تاہم حکومت کا کام زیادہ دیرپا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے جانشینوں کا بہت محتاج ہوتا ہے۔ قیادت ہی انسانوں کو غلامی کی اس بڑی لعنت سے نجات دلا سکتی ہے جو انسانوں کے دلوں سے محنت کی عظمت اٹھا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان اپنی دوسری عظمتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اسی غلامی کی وجہ سے ہم مسلمان ہونے کے باوجود اور عظیم المرتبہ اور لاثانی شخصیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کے باوجود ان کی ذاتی زندگی مبارک سے پوری طرح متاثر نہیں ہیں۔ وہ تو اپنے ذاتی کام خود اپنے دست مبارک سے کرتے تھے حتیٰ کہ پڑوسیوں کے کام میں بھی امداد فرماتے تھے۔ مگر ہم لوگ تو اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا ہی سب سے بڑی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ جس کو تھوڑی بہت آسائش مہیا ہو گئی وہ اپنے لئے گویا ناکارہ ہو گیا۔ ہمارے افسر اور حکمران تو اس امر کے بھی محتاج ہوتے ہیں کہ انہیں جوتے کوئی دوسرا پہنائے اور ان کے تسمے بھی کوئی دوسرا باندھے۔ تو "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ" کے مطابق باقی لوگ تو پھر اس سے بھی اگلی منزل کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اس سے جو فکری زوال ہوتا ہے اور جو محتاجی اور دوسروں پر انحصار کا عنصر زندگی پر قبضہ کر لیتا ہے اور جو وقت ضائع ہوتا ہے' ہم لوگ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ میں نے بھٹو صاحب کے ساتھ اس کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ میں نے کہا "میرے خیال میں تو ایک علاج یہ ہے کہ ایک ایسا ادارہ بنایا جائے جس کو "لیبر اکاڈمی" کہا جائے۔ اس میں مہینہ یا دو مہینے کے لئے جیسا مناسب ہو صدر مملکت' وزیراعظم' وزراء اعلیٰ' گورنر' کمشنر' آئی جی پولیس' علیٰ ہذا القیاس سب بڑے چھوٹے افسر باری باری وہاں جا کر رہیں۔ جگہ ایسی ہو کہ کوئی شہری سہولت نہ ہو۔ سب لوگ کپڑے خود دھوئیں' جھاڑو خود دیں' کھانا خود پکائیں۔ دن کو زمین میں کاشتکاروں اور کسانوں کے ساتھ مل کر کام بھی کریں' اپنے غسل خانے خود اپنے "مبارک" ہاتھوں سے صاف کریں۔ کوئی کسی کا مددگار یا نوکر نہ ہو۔ تاکہ دوسرے لوگوں میں بھی یہ جذبہ جس کو فنا کر دیا گیا ہے' پھر سے بیدار ہو جائے اور وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو اپنی توہین نہ خیال کریں۔ جب تک ایسا نہیں ہو گا باقی لوگ اس پر نہیں چلیں

Marfat.com

گے۔ پھر میں نے کہا کہ ملازمتوں کے لئے بھی یہ شرط رکھ دی جائے کہ جب تک کسی نے کسی لیبر کیمپ میں دو ماہ بلکہ چھ ماہ کام نہ کیا ہو' وہ کسی سرکاری ملازمت میں نہ آسکے۔ باقی ملازمین کے لئے بھی ان کیمپوں میں کبھی کبھی پروگرام کے مطابق جا کر قیام کرنا ضروری ہو۔ اسی طرح میں نے کہا کہ سکولوں اور کالجوں میں بھی اس کام کو قومی ترقیاتی کاموں کے ساتھ ہم آہنگ کر دینا چاہئے"۔ چنانچہ میں نے اس بار اپنی حکومت کے دوران بہت معمولی اور ادنیٰ ابتدائی سطح پر اس کام کا آغاز کر دیا تھا جس کا اثر میرا خیال ہے کہ ابھی تک کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ اس کا دنیا بھر میں چرچا ہوا ہمارے خیالی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو پریشانی ہوئی کہ میں نے ان کے مقاصد کو چھین لیا ہے۔ بین الاقوامی ادارہ خوراک کی جانب سے ہر ملک میں وہ تصاویر اور فلمیں دکھائی گئیں۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی ادارہ نہیں تھا اس لئے وہ میرے بعد خود بخود ختم ہو گیا۔

مثالیں تو ہم سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دیتے ہیں مگر کیا مجال کہ ہمارا ڈرائیور' چوکیدار یا کوئی دوسرا خادم ہمارے سامنے بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھائے۔ وہی گورے اور کالے کی تمیز جس کو رسول اللہؐ نے مٹایا تھا اور جس کو انگریز نے پھیلایا' وہ ابھی تک قائم و دائم ہے۔ صدارت کے دوران میں نے جب کبھی پہرے داروں اور دوسروں کو میز پر بلایا تو حیرت سے میرا منہ تکتے تھے کہ یہ صدر کیسی فضول بات کر رہا ہے۔ میں فیصل آباد کے ہوائی اڈے کے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا تو ایک سوٹ بوٹ والا شخص آیا۔ بیٹھنے کی اجازت چاہی تو میں نے جگہ بنا دی اور پاس بٹھایا۔ اس نے پوچھا "آپ کون ہیں؟" میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ رو پڑا۔ وہ کوئی درمیانے درجے کا انجینئر تھا۔ کہنے لگا "کبھی ایسا وقت آسکتا ہے کہ ہم بھی اپنے بڑے لوگوں کے ساتھ اس طرح گھل مل کر بیٹھیں"۔ یہ سب وہ لعنتیں ہیں جو غلامی کی پیداوار ہیں۔ ان کو ایک صحیح قیادت ہی دور کر سکتی ہے۔ از خود اول تو دور نہیں ہو سکتیں اور اگر رخ مڑ گیا تو پھر وہ محض انتہائی مخالف ردِّ عمل ہو گا' اصلاحی نہیں۔ الغرض قیادت کے بغیر یہ مخلوق بھیڑ بکری کے سوا کچھ نہیں خواہ ان کا علم و فضل جتنا بھی ہو اور وہ قیادت ہمیں ابھی میسر نہیں۔

قومی یکجہتی میں فوج کا کردار

ملک کے اندر اتحاد اور یکجہتی کی میری یہ سوچ کوئی سطحی امر نہیں ہے' نہ کسی وقتی مصلحت کی پیداوار ہے۔ لیکن اتحاد اگرچہ اپنے اصل کی وجہ سے بھی بہت عزیز اور قابل قدر شے ہے تاہم اس میں ان حالات وواقعات کا بہت دخل ہے جو اتحاد کا فوری تقاضا کرتے ہیں اور جو اس سے طبعاً متاثر ہوتے ہیں۔ وہ حالات بھی اب ایک مستقل نوعیت اختیار کر گئے ہیں اور اگر ان کا کوئی علاج مقصود ہے تو پھر اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ میرے وہ سب احباب جو ۱۹۷۶ء میں قید کے دوران مجھے پلنڈری جیل میں ملنے آتے تھے' سب

Marfat.com

کو علم ہے کہ میں اس وقت بھی یہ کہتا تھا کہ ہمارے ملک کے آئندہ حالات کا تقاضا اب یہ ہے کہ سیاستدان اور فوج مل کر کام کریں۔ یہ بات اس وقت تو سیاستدانوں کو گالی محسوس ہوتی تھی۔ مگر زیادہ دیر نہ لگی کہ حالات نے وہی رخ اختیار کر لیا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں سیاست میں فوج کے اس طرح آنے کے کبھی بھی حق میں تھا۔ بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس ملک میں صرف دو ہی شخص ہوں جو سیاست سے فوج کو اصولاً علیحدہ رکھنا چاہتے ہوں تو یقیناً ایک میں ہوں گا۔ وہ ۳ جولائی ۱۹۷۸ء والی بات جو آپ کے ساتھ ہوئی تھی' اس کی بہت واضح دلیل ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ بات کرنا ایک عظیم خطرے کو دعوت دینا تھا جیسا کہ بعد میں ثابت بھی ہوا۔ جب یہ معلوم ہو کہ وہ واقعہ ہونے ہی والا ہے اور اس کو روکا بھی نہیں جا سکتا تو اس وقت وہ بات کرنا تو سمندر میں رہ کر مگرمچھ کے ساتھ دشمنی کے سوا کیا تھا۔ مگر چونکہ ایک اصولی بات تھی' اس لئے میں نے اس خطرہ کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ ایک عامیانہ مصلحت کا تقاضا وہی تھا جو بعض نے اختیار کیا۔ کچھ نے کہا فوج ضرور آئے' تو کچھ نے کہا "آتی ہے تو آنے دو ہم کیا کریں"۔ لیکن میری کمزوری یہ ہے کہ جب فوج آ گئی تو پھر میں اس حق میں نہیں تھا کہ فوج کو بے عزت اور ذلیل اور ناکام کر کے نکالا جائے۔ فوج کے لوگ خود اگر اپنے لئے ایسا کریں تو وہ میرے بس میں نہیں ہے لیکن میری خواہش پھر بھی یہی ہوگی کہ ہماری افواج کو ہماری بھرپور اخلاقی حمایت حاصل رہے ورنہ فوج رکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے اس خیال کو کوئی راز نہیں رکھا۔ میں نے ضیاء الحق صاحب سے بھی ذکر کیا اور پھر پشاور میں قومی اتحاد کی آخری میٹنگ میں میں نے کھل کر اس بات کا ذکر کیا جس کی تائید پروفیسر خورشید نے بھی کی تھی۔ بعض کے نزدیک تو گھنٹی کون باندھنے والی بات تھی۔

لیکن بدقسمتی سے ہماری فوجی حکومت کا طرز عمل بھی ایک دوسری انتہا پر ہے۔ جس طرح سیاستدان بوجوہ سیاست میں فوج کی مداخلت یا شرکت کو غلط اور ناقابل فہم قرار دیتے ہیں' عین اسی طرح فوجی حکمران بھی "بوجوہ" سیاست میں سیاستدانوں کا داخلہ ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یہ انتہائی غیر صحت مند سوچ ہے اور ملک کے مفادات کے لئے زہر قاتل ہے۔ ہمیں پوری نیک نیتی اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہئے اور اپنی انا کو ملک کی انا پر مقدم نہیں رکھنا چاہئے' نہ اپنے ذاتی وقار کو ملک کے وقار پر ترجیح دی جانی چاہئے۔ قومی حکومت کی میری وہ تجویز بھی اسی کی ایک کڑی تھی۔

قومی یکجہتی کیلئے جدوجہد

میں جو ملک کے اندر اتحاد اور یکجہتی پر زور دیتا رہتا ہوں تو یہ محض اسی قدر نہیں ہے کہ میں دوسروں کو درس دے رہا ہوں اور خود اس سے بیگانہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کرتا ہوں۔ میں نے اس فکر کو اپنی

Marfat.com

زندگی میں ہر ممکن حد تک اپنانے کی کوشش کی ہے، وہ ذاتی معاملات ہوں یا اجتماعی۔ میں حکومت سے باہر ہوں یا اندر، میں نے دونوں صورتوں میں اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں پہلی بار صدر بنا، تب بھی ہم نے ایک اتحاد کیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں جو انتخابات ہوئے، وہ بھی ہمارے اتحاد کا نتیجہ تھے جن کے نتیجے میں میں صدر منتخب ہوا تھا اور اس اتحاد کے لئے بھی میں نے ہی پیش قدمی کی تھی۔ جب میں صدر منتخب ہو گیا تو میں سب سے پہلے اپنے دونوں حریفوں سے ملنے گیا۔ خورشید صاحب اتفاق سے لاہور جا چکے تھے۔ سردار محمد ابراہیم خان صاحب سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ میں نے ان کو مل کر کام کرنے کی پیشکش کی جس کو انہوں نے چند دنوں بعد مان لیا اور ہم لوگ ساڑھے چار سال اکٹھے رہے، جس کے نتائج بھی صرف ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ پورے علاقہ کے لئے مفید رہے۔ خورشید صاحب کے ساتھ تو میں نے اپنی طرف سے تعاون کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ بوجوہ اس سے دور رہے۔ لیکن ان کے ساتھ بھی بہت دیر تک کوئی خاص تلخی نہ ہوئی۔ محاذ رائے شماری والوں کے ساتھ بہت تلخی تھی مگر صدارت کے دوران یہ بھی متحرک نہ تھی۔ میں نے کسی دوسری جماعت کے کارکن کو غیر نہیں سمجھا بلکہ اپنے جماعتی ساتھیوں کو شکایت تھی کہ دوسری جماعت والے میرے زیادہ قریب ہیں۔ کوئی سیاسی قیدی نہیں تھا حالانکہ جن حالات میں میں صدر تھا، ان میں رواداری سے کام لینا آسان نہیں تھا۔ مستزاد یہ کہ ان سب دوستوں نے میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ کیا۔ پھر بھی صدارت کے بعد ان کے تعاون اور اتحاد کے خیال سے ہم دستکش نہیں ہوئے کیونکہ سیاست کسی کی ذاتی بات ہو تو پھر اور بات ہوتی ہے لیکن سیاست اگر قومی ہے اور قوم کے لئے ہے تو ذاتی جذبات کو ان ملی اور اجتماعی تقاضوں کے ماتحت ہی رکھنا ہو گا تب ہی کوئی صحت مندی پیدا ہو سکتی ہے۔

بہرحال اس گذارش سے میری مراد اقبالؒ مرحوم کا وہ "یافت می نہ شود" والا تخیلاتی (Ideal) مرد مومن نہیں ہے بلکہ وہ جوان عملی تقاضوں کی بنیاد پر حتی الامکان پورا اترنے کی کوشش کرے۔ قومی سیاست میں میری یہی پختہ سوچ ہے۔ "وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ وَهُوَ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ" اللہ پاک ہمارے دلوں کی کدورتوں کو دور فرمائے اور ہمیں مل جل کر اپنے مسائل حل کرنے کی توفیق دے تاکہ ہم اس دنیا میں بھی سرخرو ہوں اور آخرت میں بھی منہ دکھانے کے قابل ہو جائیں۔

اَللّٰهُمَّ يَا جَامِعَ الْمُتَفَرِّقِيْنَ وَيَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ وَالْاَبْصَارِ اَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

سردار محمد عبدالقیوم خاں

ذخیرہ

Marfat.com

Marfat.com

جنگ پبلشرز

Marfat.com